آزاد غلام

ابراھیم جلیس

گوشۂ ادب • چوک انارکلی لاہور
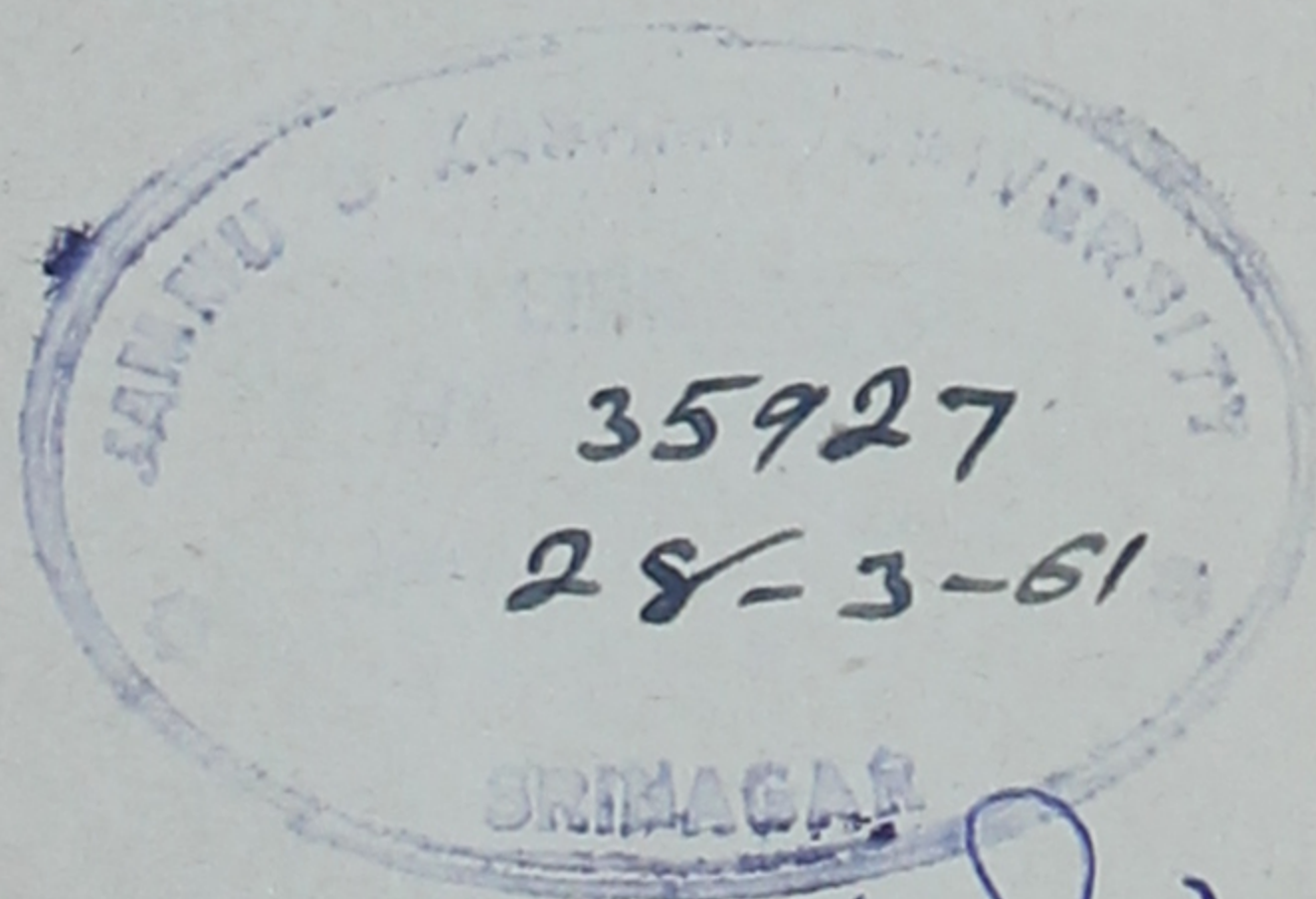
آزاد غلام

۱۰۰۰
بارِ اوّل

جنوری
۱۹۵۵ء

بلا جلد
قیمت دو روپے

اِنشا پریس لاہور میں طبع ہوا۔

فہرس

آزاد غلام

ہندوستان اور پاکستان کے وزراء اعظم کے نام

اٹھارہ سال کے بعد آج

بابو دین محمد کی زوجہ شاکراں بڑی خوش خوش گھر کے سارے کمروں میں سامان اکٹھا کرتی، باندھتی، پھر رہی تھی، لیکن اس کی نوجوان لڑکی فاخراں اداس ایک ٹرنک پر بیٹھ گئی تھی۔ شاکراں اس لئے خوش تھی کہ اس کرائے کے بوسیدہ اور پرہول مکان میں زندگی گذارتے گذارتے اٹھارہ سال بیت چکے تھے اور اب اس اٹھارہ سال تک ایک ایک پیسہ جوڑ کر گویا اپنے ذاتی مکان کے لئے ایک ایک اینٹ جمع کی تھی۔

جواب انبالہ چھاؤنی کے سب سے زیادہ پُر رونق بازار لال کرتی میں مکمل
طور پر تعمیر ہو چکا تھا۔ اور جہاں شام ہونے سے پہلے پہلے بابو دین محمد
اس کی زوجہ اور اس کی لڑکی منتقل ہونے والے تھے

فاخراں کو اسطرح اداس اور چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر ماں نے
کہا۔ بیٹی تو تھک گئی۔ بس ذرا چھوٹا موٹا سامان تو باندھ دے۔ تیرے
ابا بھی دفتر سے آتے ہی ہونگے۔ اور کیا معلوم وہ تانگے بھی لے کر آ جائیں
اور یہاں سامان تیار ہی نہ ہو ـــ ہمیں تو شام سے پہلے اپنے
نئے گھر میں پہنچنا ہے۔ اسے سجانا سنوارنا ہے۔ پھر اندھیرا ہو
جائے گا تو ...... اونہہ اندھیرا ہو جائے گا۔ تو کیا ہوگا۔ وہاں
تو بجلی کی روشنی بھی ہے۔ یہاں کی طرح مٹی کے تیل کے چراغ تھوڑے
ہی ہیں۔

نہ جانے کیوں میری عقل ماری گئی ہے ... وہاں تو رات
بھی سامان جمایا جا سکتا ہے۔

شاکراں کو نئے ذاتی مکان میں جانے اور بسنے کے خیال ہی سے
بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ بے حد خوشی، بے اندازہ خوشی، اور اس خوشی

ہیں وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ خود ہی سوال پوچھتی اور خود
ہی جواب دیتی۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ فاخراں کیوں اداس بیٹھی ہے
اور اس کو فاخراں کی اداسی کا راز کس طرح معلوم ہو سکتا تھا۔ بیٹی اپنی
محبت کا راز ماں باپ یا بھائی یا کسی اور کو کیسے بتا سکتی ہے۔ یا وہ اپنی
ماں سے کیسے کہہ دے کہ اسے اپنے نئے اور ذاتی مکان میں جانے کی
خوشی کے بجائے اس کرایہ کے مکان کو چھوڑنے کا بے حد دکھ ناقابل بیان
دکھ ہے۔ کیونکہ یہ مکان کرایہ کا سہی، بوسیدہ سہی مگر اس کے داہنے
کمرے کے دیوار میں ایک کھڑکی ہے۔ جو سامنے والے مکان کی کھڑکی
کے روبرو ہے۔ جس میں سے سردار محمد کا چہرہ جھانکا کرتا ہے۔ سردار
محمد جو ایک لمبا تڑنگا خوبصورت، الجھے بکھرے بالوں والا نوجوان تھا۔ جو
پانچویں پنجاب رجمنٹ میں حولدار تھا۔ اور جسکو چوری چھپے فاخراں نے
اپنا دل بھی دے دیا تھا ـــ کسی کو معلوم نہ تھا، اور کسی کو کیسے معلوم
ہو سکتا تھا۔ دل تو ہمیشہ چوری چھپے ہی دیا جاتا ہے۔

فاخراں ٹرنک، رضائیاں، برتن کپڑے اٹھاتے تھوڑی تھوڑی
دیر بعد اس کھڑکی سے بھی ضرور جھانک آتی۔ جس کے مقابل سردار محمد

کی کھڑکی پر ساگوان کے میلے کھُردرے تختے بند تھے۔ سردار محمد بھی ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ اور اس کی کھڑکی بھی شام کو پانچ بجے کھلا کرتی تھی۔ کاش سردار محمد ڈیوٹی سے آج جلد لوٹ آئے۔ تاکہ اس کی خاطر ان آنکھوں میں آنسو بھر کر اُسے آخری بار دیکھ سکے۔ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جائیں۔ یا پھر وہ کھڑکی کو بند کر دے۔

مکان کے باہر تین تانگے کھڑکھڑاتے ہوئے رکے۔ بابو دین محمد گھر میں داخل ہوا، اور اس نے سامان کو ابھی تک تیار نہ دیکھ کر اپنی زوجہ کو خوب ڈانٹا۔ اس کی زوجہ نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟ بڑے گرم ہو؟"

دین محمد نے اور زیادہ برافروختہ ہو کر کہا۔

"بکواس بند کرو اور چلو جلدی کرو۔"

اور دین محمد نے اس کی مدد کرنے کے بجائے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اور باندھے ہوئے بستر پر بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

شاکراں نے کہا۔

اسطرح بیٹھے رہنے کے بجائے کچھ میرا ہاتھ تو بٹاؤ۔"

دین محمد غصّے سے بے قابو ہو کر بولا۔

"اب چپ بھی کرے گی یا نہیں ـــ یا اللہ یہ کیا عذاب ہے۔ نہ دفتر میں چین نہ گھر پر چین۔ ہر جگہ تو تو میں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شاکراں اس کو حیران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ دین محمد بڑا خاموش، بڑا ضبط کرنے والا، بڑا صابر و شاکر آدمی تھا۔ شادی کے اٹھارہ سال گذر چکے تھے۔ لیکن دونوں میں شاید پندرہ بیس لڑائیاں ایک ایک دو دو دن بات بند، پھر ایک رات اور ایک ہی چارپائی۔ اور پھر لڑائی کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوتی، مگر آج تو بغیر کسی وجہ کے اتنا غصّہ اتنا جلال .... شاکراں کے نسائی غرور پر یہ بلاوجہ کا غصّہ ایک ناقابلِ برداشت ٹھیس ضرور تھی، اور عورت تو فوراً ہی روٹھ جانے اور بڑی دیر بعد من جانے کی عادی ہوتی ہے۔ لیکن شاکراں نے روٹھنے کے خیال ہی کو دل سے نکال دیا۔ کیونکہ آج نئے اور ذاتی مکان میں جانا تھا۔ وہ نیا اور ذاتی مکان جس کی اینٹیں اکھٹی کرنے کے لئے شاکراں نے گھر کے دوسرے اخراجات کم کر کے ایک ایک پیسہ بچا کر

اٹھارہ سال تک پیہم تکلیفیں اٹھائی تھیں ـــــ محبت مرد یا شادی کے علاوہ عورت ایک گھر پر بھی جان دیتی ہے، گھر جو اس کا اپنا ہو ذاتی ہو جہاں وہ مالک بن کر بیٹھی رہے۔

شاکراں نے دین محمد کے غصہ کو ہمیشہ کی طرح کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور اپنے کام میں لگی رہی۔ مگر اسے ہلکا سا دکھ تھا کہ یہ اس کے شوہر کو کیا ہو گیا ہے کہ نئے مکان میں جاتے وقت کچھ ناراض سا ہے اور یہ کتنی بدشگونی ہے۔ حالانکہ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ نئے مکان میں اسباب جمانے اور سجانے کے بعد رات گئے جب وہ تھک کر اپنے شوہر سے جسم ملا کر لیٹے گی تو اس تھکن کے باوجود بڑی دیر تک اسے نیند نہ آئے گی۔ وہ اس کے ساتھ لیٹے لیٹے باتیں کرتی رہے گی کیونکہ کرائے کے مکان میں شوہر کے ساتھ لیٹنے میں اسے اتنا مزا نہیں آتا۔ جیسے وہ خود بھی کرائے کی ہے ۔۔۔

دو تانگوں میں سامان لادا گیا اور تیسرے تانگے میں چھوٹے ہوئے سامان کے ساتھ بابو دین محمد بیٹھ گیا۔ فاخراں نے آخری بار سردار محمدؐ کی کھڑکی کے بند پٹوں کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

لیکن آنکھوں میں آنسو سے بھر جانے سے پہلے ہی اسنے اپنی کھڑکی بند کر دی۔

محبت کی کھڑکی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرکے وہ نئے مکان کی طرف چلی۔ لیکن شاکراں سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے!

اس کی آنکھوں میں آنسو!

یہ کیا بدشگونی ہے آخر!!

نئے مکان میں قدم رکھ کر جب دین محمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی موج بہہ نکلی ——— اور فاخراں کی بڑی اور چمکیلی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ دکھائی دیا۔ تو شاکراں نے محسوس کیا کہ یہ بدشگونی تو صرف اس کے اپنے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا فاخراں کے آنسو یا بابو دین محمد کے غصّے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور سچ مچ بابو دین محمد کے غصّے کا شاکراں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی۔ کہ جب وہ دفتر میں بابو دین محمد نے اپنے ساتھی کلرکوں سے کہا تھا۔ کہ آج وہ اپنے نئے اور ذاتی مکان میں منتقل ہو رہا ہے۔ تو ہیڈ کلرک کرتار سنگھ نے بابو دین محمد کے عہدے کے خیال کو

پس پشت ڈال کر اپنی ذاتی بے تکلفی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر چوٹ کی تھی کہ

"بابو صاحب" اپنے نئے مکان کا نام رکھو۔"

"رشوت محل"

سب لوگ ہنس پڑے تھے اور بابو دین محمد نے غصے میں آ کر اور یہ سب بھول کر کہ وہ ہیڈ کلرک ہے اور کرتار سنگھ ایک ڈسپیچ کلرک ۔۔۔ کرتار سنگھ کی نکٹائی پکڑ لی۔ مگر کرتار سنگھ جو بابو دین محمد کے نئے تعمیر شدہ مکان کو دیکھ کر احساس نامحرومی کے اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ جھگڑنے پر تیار ہو گیا۔ اور بیچ بچاؤ کرنے والے کلرکوں سے کہنے لگا۔

"میں ۔۔۔ ہاں میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ رشوت محل ہے۔ ورنہ کیا ڈسٹرکٹ کمشنر آفس کا ایک ہیڈ کلرک گیارہ ہزار روپئے کی کوٹھی بنا سکتا ہے۔"

واہ"

دوسرے سب کلرک اور ساری دنیا یہی سمجھتی ہو کہ بابو دین محمد نے

نے رشوت لے لے کر یہ مکان تعمیر کیا ہے۔ لیکن اصل بات تو یہ تھی۔ کہ اس کی کفایت شعار زوجہ نے ایک ذاتی مکان کے لئے جائز تنخواہ سے تھوڑے تھوڑے روپئے متواتر اٹھارہ سال سے جمع کئے تھے۔ میکے سے ملے ہوئے روپوں کو بھی اس نے مکان ہی کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے پانچ چھ سال سے اپنے لئے نئے کپڑے بھی نہیں بنوائے تھے۔ چار پانچ شلواریں۔ چار پانچ قمیصیں اور صرف دو دو پٹے.... اگر کبھی کبھار اسنے کچھ کپڑا اور زیور خریدا بھی تو اپنی جوان لڑکی کے لئے ــــ مگر اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے اس دنیا میں ایک اچھا اور ذاتی مکان، چھوڑ جائے۔

مکان بن چکا تھا۔ کرتار سنگھ اور کرتار سنگھ جیسے لوگوں کی فضول خرچ بیویاں اور کرائے کے مکانوں میں رہنے والے سب انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔

رشوت محل

رشوت محل

بکنے دو کمینوں کو، اپنی آگ میں آپ ہی جل مریں گے"
بابو دین محمد چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو، شاکراں ضرور دل سے
یہی چاہتی تھی۔ کہ جب اس کا مکان بن جائے۔ اور وہ اس میں
مالکن کی طرح بیٹھی ہو۔ تو اس کی سہیلیاں ملنے جلنے والیاں اور آڑوس
پڑوس کے لوگ اس کے مکان کو دیکھ دیکھ کر جلا کریں۔ کڑھا کریں
۔ شاکراں آخر ایک عورت تھی نا۔ اسے اپنے سات کمروں دو۔
دالانوں ایک باورچی خانے ایک حمام، بڑے کھلے صحن والے مکان کی
مکانیت اور ہر کمرے میں جلنے والے بجلی کے بلب اور دوسری آرائشوں
کا خیال آنے سے پہلے عام لوگوں کا خیال آتا تھا کہ وہ اسکے مکان کی طرف
حسد سے نظریں اٹھا کر دیکھیں گے کہ ارے دیکھو یہ شاکراں کا ذاتی مکان
ہے۔ جیسے شاکراں نے اپنی رہائش اور اپنے آرام و آسائش کیلئے یہ مکان
تعمیر نہ کرایا ہو، بلکہ لوگوں کے لئے تعمیر کرایا ہو۔ جبھی تو وہ اپنے نئے مکان
میں اپنے سارے رشتہ داروں، سہیلیوں اور اڑوس پڑوس کے
لوگوں کو ایک بہت بڑی دعوت دینے کا پروگرام بھی بنا چکی تھی۔
بابو دین محمدؐ نے مکان کی باہر والی بالکونی کی پیشانی پر پتھر کے

ایک کتبے پر مکان کا نام بھی کندہ کرایا تھا۔

فاخراں منزل

سنہ ۱۹۴۶ء

لیکن کرمار سنگھ اور اس جیسے بد طینت اور حاسد لوگ اس مکان کے آگے سے گذرتے ہوئے شرارتاً کھنگارتے تھے۔

آخر ہم۔ اُوغ غوم ..... رشوت محل!

نئے مکان میں کھڑکیاں تو بہت تھیں۔ بڑی بڑی رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکیاں مگر کوئی کھڑکی ایسی نہیں تھی جو رجمنٹ بازار کے اس مکان کے روبرو کھلتی ہو۔ جس میں سے سردار محمد جھانکا کرتا تھا۔ اسی لئے فاخراں بڑی اداس رہتی تھی۔ چپ چاپ اور خاموش ... شاکراں سوچتی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا کرتی اور حیران تھی۔ کہ اپنے نئے اور ذاتی مکان میں آنے کی بھی اس لڑکی کو کوئی خوشی نہیں۔ جب دیکھو جب دیکھو اداس — حالانکہ کنواری لڑکی تو ..... شاکراں نے بڑی سوچ بچار کے بعد صرف یہی نتیجہ نکالا کہ فاخراں کی عمر اب سولہ سال ہو گئی ہے۔ اور جب لڑکی کی عمر سولہ سال کی ہو جائے تو بس!

ایک رات عام ماؤں کی طرح اس نے بالو دین محمد سے ذکر چھیڑ ہی دیا کہ فاخراں اب سولھویں برس میں ہے۔ اب ہمارا کیا ہے۔ ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ جانے کب آنکھ بند ہو۔ اس لئے میری آخری خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد اپنی بیٹی کی زلفوں میں راتش چھڑک کر مانگ میں افشاں چن کر اس کی ہتیلیوں اور تلووں کو مہندی سے رنگ کر اس کو پھولوں میں چھپا کر، خوشبوؤں میں بسا کر، اسکے سر پر سرخ آنچل اوڑھا کر اسے دلہن بنا کر دیکھوں۔۔ پھر اسکے بعد موت بھی آجائے تو فکر نہیں۔

شہر کے بوڑھوں اور بڑھیوں سے بات چیت شروع ہو گئی بات چیت ہوتی رہی۔ بات چیت ختم ہو گئی۔ اور باجوں ڈھولوں تاشوں اور نفیریوں کا شور شروع ہو گیا۔ بادام، مصری، چھوہارے برسائے گئے۔ اور سہرا گو شاعر لوگوں کے ہجوم میں سہرا پڑھنے لگا۔

دیتے ہیں شیر محمد کو مبارک پیہم،
گا رہے ہیں جو گلستاں میں عنادل سہرا

شیر محمد۔

سردار محمد نہیں، شیر محمد

رجمنٹ بازار والا سردار محمد نہیں، بلکہ اسٹاف روڈ والا شیر محمد

فاخراں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاکراں اسکے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے دلاسا دینے لگی۔ بیٹی نہ رو میری بچی۔ تو کہیں اور گھر تھوڑے ہی جا رہی ہے۔ تو تو یہیں رہے گی میری بچی اسی گھر میں تو اور تیرا شوہر دونوں یہیں رہیں گے۔ یہ گھر اب تم دونوں کا ہے بیٹی۔

فاخراں روتی رہی ان گنت بے زبان لڑکیوں کے اس وسیع و عریض ملک کے ایک اور گھر میں ایک اور لڑکی اس کے گھر میں سردار محمد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے چھپا کر شیر محمد کے آگے بے نقاب ہو گئی۔

شادی خانہ آبادی کی مبارک باد دینے کے لیئے بہت سے لوگ آئے تھے۔ مگر سردار محمد نہیں آیا۔ اور وہ کیسے آسکتا تھا۔ فاخراں اسے اپنے دل میں سے باہر نکلنے بھی تو دے!

(۲)

نئے مکان میں آکر بابو دین محمد اور اس کی زوجہ کی مسرتوں کا کوئی

ٹھکانا ہی نہ تھا۔ دونوں ہر لمحہ محسوس کرتے تھے جیسے انکی زندگی اصل معنوں میں ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف فرصت ہی فرصت ہے موت کے دروازے پر پہونچنے تک کوئی کام ہی نہیں۔ کوئی شغلہ نہیں سارے کام ختم ہو چکے تھے گھر بن چکا تھا شادی خانہ آبادی ہو چکی تھی۔ گھر داماد بھی مل گیا تھا۔

دن سپاٹ گذر رہے تھے۔ لمبے دن اور لمبی راتیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سورج دیر سے ڈوبتا ہے اور دیر سے طلوع ہوتا ہے بابو دین محمد کا خیال تھا۔ کہ اب وہ پنشن لے لے پچپن برس کی عمر میں بھلا روز روز کہاں دفتر گھستا پھرے۔ اور پھر شبیر محمد بڑا کماؤ لڑکا تھا۔ سیٹھ پرتم ناتھ جی اینڈ سن پرو پرائٹر پنجاب موٹر ورکس میں منیجر تھا۔ ماہانہ اڑھائی سو روپے تنخواہ تھی۔ اور بزنس کے لئے دور دور شہروں۔ کلکتہ۔ دہلی۔ مدراس، بمبئی وغیرہ گھوما کرتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اپنی فاخراں کو بھی بڑے بڑے شہروں کی سیر کراتا تھا۔ مگر اب کے وہ کلکتہ گیا تو فاخراں کو کسی وجہ سے ساتھ نہ لے جا سکا۔ وہ کلکتہ گیا اور خلاف توقع پانچویں دن ہی لوٹ آیا۔ اور شاکراں سے بولا۔

اماں جی ـــــ اچھا ہی ہوا کہ میں فاخراں کو ساتھ نہ لے جا سکا۔ شہر میں دنگا فساد ہو گیا۔ ہندو مسلمانوں کی بڑی زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی میں مانک ٹولہ سٹریٹ پر ٹھہرا تھا۔ مگر وہاں بھی فساد شروع ہو گیا واپس سٹیشن بھاگتے وقت میں نے خود اپنی آنکھوں سے فٹ پاتھ پر بیس لاشیں پڑی دیکھیں۔۔۔۔ اور ـــ میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں"

بشیر محمد کلکتہ سے تو جان بچا کر واپس آ گیا۔ لیکن مانک ٹولہ اسٹریٹ جیسے اس کے تعاقب میں چل پڑی تھی۔ کلکتہ سے باہر نکل آئی تھی۔ انسانی لہو میں نہائی ہوئی اپنی پیٹھ پر لاشوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کے انبار اٹھائے نواکھالی پہونچی۔ نواکھالی سے بہار آئی اور بہار کی بھری پڑی آبادیوں کو ڈستی نگلتی دہلی پہونچی۔ دہلی سے جہاں انبالہ قریب ہے فرنٹیئر میل رات کو نو بجے چل کر صبح چار بجے وہاں پہونچ جاتی ہے اور صبح کو چار بجے انبالہ میں بھی دہشت ہنگامہ اور بھاگ دوڑ مچ گئی مانک ٹولہ سٹریٹ کلکتہ سے نکل کر انبالہ بھی پہنچ گئی تھی۔ کوتوالی بازار قاضی واڑہ اور تندرول والے بازار میں گھومتی پھرتی ادھر چھاؤنی میں درگا چرن روڈ سے لال کرتی بازار کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں فاخراں منزل

میں شیر محمد گھبرائے ہوئے لہجہ میں اپنی ساس اور فاخراں سے کہہ رہا تھا

"ہمیں جلد ہی یہ مکان چھوڑ دینا چاہئے۔ سب مسلمان پاکستان بھاگ رہے ہیں۔ ہم بھی یہاں نہیں رہ سکتے۔ چلو سامان اٹھاؤ۔"

بوڑھی ساس دیوانی عورت کی طرح شیر محمد کو گھور رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی!

نہیں ہرگز نہیں — یہ مکان میرا ہے۔ اٹھارہ سال تک اس کی ایک ایک اینٹ جوڑ کر میں نے یہ مکان بنایا ہے۔ میں نہیں جاؤنگی — تم جاؤ.... مگر تم کیسے جا سکتے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے — رسول کی قسم میں اپنی بیٹی کو تو نہ جانے دوں گی۔ تم جاؤ — تم منہ کالا کرو۔"

شیر محمد پریشان ہوگیا تھا۔

"اماں جی — میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ وقت گذر جائے گا تو پھر جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑینگے۔"

اتنے میں بابو دین محمد بھی ہانپتا کانپتا پریشان گھر پہونچا اور گھبرائے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں بولنے لگا۔!

چلو جلدی جلدی اسباب باندھو - صرف ضرورت کی چیزیں ساتھ رکھو - باقی سب یہیں چھوڑ دو ــــ چلو جلدی کرو - "

شاکراں جیسے پاگل ہو گئی تھی - پھر چیخنے لگی -

"چپ رہو، تمہاری عقل بھی ماری گئی ہے کیا! میں یہ مکان نہیں چھوڑوں گی ــــ اٹھارہ سال تک اس مکان کی ایک ایک اینٹ جمع کی ہے - تم جاؤ میں یہ مکان ہرگز نہیں چھوڑوں گی - یہ میرا مکان ہے -

یہ میرا مکان ہے !!"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

دروازے پر دستک ہوئی - بابو دین محمد نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا - کرتار سنگھ دروازے پر کھڑا تھا - شراب کے نشے میں دھت بابو دین محمد کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگا - مگر اچانک سنجیدہ ہو کر اس نے کہا

بابو شاب - گھبراؤ نہیں، میں تمہیں مارنے نہیں آیا ہوں ہی ایک . . . . ہاں وہ جوگندر سنگھ اور من موہن لال تمہیں مارنا چاہتے ہیں ــــ میں پالا دوشت ہوں نا تمہارا -

بھائی .... ہی ہک .... اشی لئے تمہارے

پاشس ایا ہوں --- ہو شکے تو کسی طرح بھاگ جاؤ ---

جاؤ.... ہی ہک ....

..... میرا کہا شنا معاف کر دینا..... ہی..'

بابو دین محمد نے سڑک کو گہرے اندھیرے ڈوبا دیکھ کر بھرائی

آواز میں پوچھا۔

" کدھر جاؤں کرتارے ---کدھر جاؤں یار ؟"

کرتار سنگھ نشے میں جھوم جھوم کر ہنسنے لگا۔

" ادھر تمہارے پاکستان کو جاؤ بابو شاب... ہی ہی ہی...

وہ بھی تو رشوت محل ہے بابو شاب۔"

ہی ہی ہک.......

بابو دین محمد پاکستان کی یہ بے عزتی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے پاکستان کے لئے کئی بار حسب حیثیت چھوٹے موٹے چندے دئے تھے۔ اس کے لئے نمازیں پڑھی تھیں۔ دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن اسوقت چونکہ کرتار سنگھ نشے میں تھا۔ اور اسکی بغل

میں کرپان تھی۔ اور مالک ٹولہ اسٹریٹ لال کرتی بازار میں داخل ہو رہی تھی اس لئے بابو دین محمد چپ چاپ اندر چلا آیا۔

(۲)

بابو دین محمد اور اس کا کنبہ محبت کی کھڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر کے نئے وطن کی طرف چلا۔ ریلوے سٹیشن پر پاکستان سپیشل تیار کھڑی تھی۔ اور ادھر ایک غریب ہیڈ کلرک کی اٹھارہ سالہ مصیبتوں کی بنائی ہوئی دُنیا لال کرتی بازار میں جل رہی تھی۔ شعلے اڑا رہی تھی اور اینٹیں گرا رہی تھی۔ اور اوپر فضا میں ہوائی جہاز، لیاقت علی خان کا ہوائی جہاز، غلام محمد کا ہوائی جہاز، چودھری خلیق الزماں کا ہوائی جہاز،...

اور نیچے زمین پر پاکستان سپیشل انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سے رینگتی ہوئی نکل رہی تھی۔ پاکستان سپیشل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی مرد عورتیں، بوڑھے، بچے، بوریاں، بستر، صندوقیں، بالٹیاں، حقے ــــ آدمی پر آدمی سوار تھے۔ حبس، گھٹن پسینہ اور سانسوں کا تعفن، موت کا خوف جینے کی خواہش ــــ فضا میں گولیوں کی سنسناہٹ گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکے، مرتے ہوئے

انسانوں کی چیخیں ـــــ یوں محسوس ہوتا تھا۔
جیسے پاکستان سپیشل موت کے پل پر سے گزر رہی ہے۔
چار میل آگے سے ریاست پٹیالہ کی سرحد شروع ہوئی چار میل
آگے سے موت کی سرحد شروع ہوئی۔ پٹیالہ کے میدانوں میں جیپ کاریں
اور ملٹیری ٹرک دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے تلواروں اور کرپانوں کی
تیز زبانیں جھانک رہی تھیں۔ بھری پری آبادیوں میں موت کی گولیاں
بکھیرتی لہلہاتی کھیتوں کو روندتی، موت کا راگ گاتی، شور مچاتی، جیپ کاریں،
سرہند کے سٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں پاکستان سپیشل ریاست پٹیالہ
کے مہاجرین کے لئے کچھ دیر رکنے والی تھی۔
حبس، گھٹن اور گرمی سے نازک بدن فاخرہ کا حلق سوکھ گیا تھا۔
زبان پر کانٹے اگ آئے تھے۔ اور سرخ سرخ ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے
اور نیم بے ہوشی کی حالت میں دھیمی دھیمی آوازمیں پکار رہی تھی۔ پانی ـــ
پانی ....
پانی کہاں تھا ـــ ہندوستان پاکستان کی سرزمینوں پر پانی کی
ساری ندیاں اور دریا اور چشمے سوکھ گئے تھے۔ صرف لہو کی ندیاں

اور لہو کے دریا بہہ رہے تھے، صرف لہو کے چشمے ابل رہے تھے۔

سرہند کا سٹیشن آگیا۔ شیر محمد بالٹی لئے اترنے لگا۔ لوگ منع کرنے لگے۔

"گاڑی سے مت اُترو۔ آڈر نہیں ہے۔"

"اڈر کی ایسی تیسی۔ میں ضرور اتروں گا۔"

"پانی — پانی!!"

"مت اُترو۔"

"میں ضرور اتروں گا۔"

شیر محمد گاڑی سے اتر گیا۔ ٹھائیں سے ایک گولی چلی۔ شیر محمد زندگی کی گاڑی سے اتر گیا۔ شیر محمد پلیٹ فارم پر لوٹنے لگا۔

پانی — پانی!

آسٹین گن کی گولی جیسے ہی جسم میں داخل ہوتی ہے۔ پیاس اچانک اور بے تحاشا بڑھ جاتی ہے شیر محمد کا تھوڑا سا خون بالٹی میں گرا ہوا تھا۔ شیر محمد پاکستان سپیشل کے پائیدان کی طرف رینگنے لگا۔ مگر پاکستان سپیشل بھی رینگ رہی تھی شیر محمد کو سرہند کے سٹیشن پر اتر کر موت کے

سٹیشن پر چھوڑ کر روانہ ہو گئی۔

بابو دین محمد پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

شیر محمد!

شیرے!!

ہو شیرے!!!

ایک آدمی نے اپنے آنسوں پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"بیٹھ جا بھائی اب کسے پکارتا ہے؟ جو نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ وہ تیری آواز نہیں سن سکتا۔ اب وہ کوئی جواب نہیں دے سکتا بے چارہ۔"

چلتی گاڑی میں اچانک بیوگی داخل ہوئی۔ اور فاخراں پر حملہ آور ہو ئی۔ فاخراں کے بال نوچ ڈالے۔ چھاتیوں پر سے اس کی قمیص پھاڑ دی۔ اس کے گالوں، پیشانی اور چھاتیوں پر لگاتار گھونسے اور تھپڑ لگانے شروع کر دئے۔ بے کسی نے بھی بیچ بچاؤ نہیں کیا۔ فاخراں کا باپ اور فاخراں کی ماں نے بھی نہیں۔ حتیٰ کہ بیوگی نے فاخراں کو پچھاڑ کر

بے ہوش کر دیا۔

جالندھر سٹیشن آیا۔

شیر محمد پاکستان سپیشل ٹرین میں نہیں تھا۔

امرت سر سٹیشن آیا۔

شیر محمد سرہند کے سٹیشن پر اترا تھا۔

لاہور سٹیشن آیا

شیر محمد تو موت کے سٹیشن پر ہی رہ گیا تھا۔

(۴)

لاہور والٹن کیمپ میں دو ہفتے رہنے کے بعد بابو دین محمد کو محلّہ سنت نگر میں کسی بھاگے ہوئے یا مقتول نریندر سنگھ کے خالی مکان پر قبضہ ملا۔ بابو دین محمد تین تانگے نہیں۔ صرف ایک ہی تانگہ لایا۔ اب اتنا اسباب ہی کہاں تھا؟ اور مفرور یا مقتول نریندر سنگھ نے بھاگتے وقت اپنی بیوی سے یہی تو کہا ہوگا۔ کہ چلو جلدی کرو۔ فوراً اسباب باندھو۔ یہ سب نہیں صرف ضرورت کی چیزیں ساتھ رکھو۔ باقی سب

یہیں چھوڑ دو۔ چلو جلدی کرو۔۔۔۔۔

جب بابو دین محمد، اس کی زوجہ فاخراں اور بیوگی چاروں اس مکان میں داخل ہوئے تو اس گھر میں کوئی انسان نہیں تھا۔ باقی سب کچھ تھا۔ جیسے الف لیلےٰ کے جنگلوں کا پراسرار مکان جس میں کہانیوں کا ہیرو۔ بھوک اور پیاس کا مارا، تھکا ہارا اندر گھس پڑا اور اس کے لئے مکان بالکل سجا سجایا ہو۔ کھانے کی میز پر انواع اقسام کے لذیذ کھانے چنے ہوئے ہوں۔ مگر نہ کوئی آدمی ہو اور نہ آدم زاد۔

بابو دین محمد سمجھ رہا تھا کہ چلو اس کی بیوی اور اس کی بیٹی یہ مکان پاکر خوش ہو جائیں گی۔ اپنے ذاتی مکان کے چھوٹ جانے کا غم دور ہو جائے گا۔ لیکن شاکراں نے جیسے مکان دیکھا ہی نہ ہو۔ مکان میں داخل ہونے کے بعد بھی اور شاید نریندر سنگھ کی بیوی کی چارپائی پر لیٹ کر بھی وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں اکیلی، اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ منحوس عورت۔۔۔ جیسے وہ ابھی پاکستان پہنچی ہی نہ ہو۔

اور فاخراں سوچ رہی تھی۔ کہ یہ دوسرا نیا مکان ۔۔۔ ان نئے

مکانوں کے مقابلے میں چھاؤنی کے رجمنٹ بازار والا پرانا بوسیدہ اور کرایہ کا مکان گویا جنت تھا۔ جنت۔ لیکن یہ نئے مکان —!! پہلے نئے مکان میں داخل ہونے وقت اس کا محبوبہ بچھڑ گیا تھا۔ اور اس کا دل اجڑ گیا تھا۔ دوسرے نئے مکان میں داخل ہوتے وقت اس کا شوہر بچھڑ گیا تھا۔ اور اُس کا جسم اجڑ گیا تھا۔ فاخراں رو رہی تھی۔ فاخراں عورت تھی نا۔ اسی لئے وہ ان مکانوں کو منحوس سمجھ رہی تھی۔ وہ بیچاری کیا جانے کہ یہ مکان منحوس نہیں بلکہ نحوست کے ذمہ دار وہ بڑے لوگ ہیں۔ وہ رہنما ہیں۔ جنہوں نے ان مکانوں میں آگ لگائی ہے۔ جنہوں نے اِن مکانوں سے انسان اور انسانیت کو بے آبرو کر کے لوٹ کھسوٹ کر، نکال کر۔ بیوگی، یتیمی، رنڈاپا، اور موت کو آباد کیا ہے۔

(۵)

دوسرے نئے مکان میں اوپر نیچے سات کمرے تھے ایک باورچی خانہ، ایک حمام، اوپر کھلی چھت — گھر کے ہر کمرے میں ضرورت کا

پورا فرنیچر تھا۔ چار پائیاں، کرسیاں، میز، وارڈروب، ڈریسنگ ٹیبل الماریاں... ایک وارڈروب میں کچھ زنانی شلواریں، زنانی قمیص، ایک لیڈیز گرم کوٹ، دو نیلونیں، ایک کوٹ —— دیوار پر ایک کیل میں ٹنگی ہوئی چار سرخ چوڑیاں۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا ایک پیتل کا اونٹ، ایک کھلونا موٹر، ایک ریڈیو سیٹ، اور ایک نوجوان لڑکی کی تصویر جس میں وہ سیاہ گون اوڑھے، ہاتھ میں بی۔ اے۔ یا ایم اے کی ڈگری پکڑے کھڑی تھی۔ ایک الماری میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اور ہر کتاب کے پہلے سادہ صفحے پر "ایشر کور" کے انگریزی دستخط اور تاریخ ثبت تھی —— اس تصویر کے اوپر سفید دیوار پر جیسے انگلی کو لہو میں ڈبو کر لکھا تھا۔

پیارے نریندر!

"تیرے بعد اس دنیا میں میرے لئے کیا رہ گیا ہے۔ میں، بھی تیرے پاس آ رہی ہوں"

صرف تیری

"ایشر کور"

فاخراں بڑی دیر سے بلکہ جب سے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ صرف یہی خونی تحریر پڑھ رہی تھی۔ جیسے یہ اسی نے لکھی ہو۔ جیسے وہی ایشر کور ہو۔ جیسے کیل پر ٹنگی ہوئی چاروں سرخ چوڑیاں اس کے سہاگ کی چوڑیاں، ہیں۔ یہ سہاگ کی سرخ سرخ چوڑیاں جو قومی رہنماؤں نے اس کی نازک اور کومل کلائیوں سے زبردستی اتار لی تھیں۔ تاکہ عورت کی کلائیاں ننگی ہو جائیں۔ اور ملک آزاد ہوں۔ تاکہ انسان مر جائے اور دنیا قائم ہو جائے۔

بیوگی، آتشی، یتیمی، اجڑی گودیوں، سربریدہ بچوں، پستان دریدہ ماؤں، بے حیا بہنوں، بے غیرت شوہروں —— بے شرم باپوں اور جلے ہوئے مسمار مکانوں کو اپنی اپنی پیٹھ پر ڈھو کر یہ ہندوستان اور یہ پاکستان آزاد ہو چکے تھے۔ سامراج کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے۔ یا سامراج کی غلامی کے لئے آزاد ہوئے تھے۔

قومی رہنما ریڈیو پر تقریریں کر رہے تھے۔ قومی فوجوں کی سلامیاں لے رہے تھے۔ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھے دربار کر رہے تھے انگریزی امریکی فلم ساز کمپنیاں ان کے لئے نیوز ریل بنا رہی تھیں۔ ریگل۔ پلازا، ڈریم لینڈ۔ اوڈین کے پردہ سیمیں پر پنڈت نہرو لال قلعے پر جھنڈا لہرا رہے

تھے - لیاقت علی خاں پاکستان کی بحری افواج کی سلامی لے رہے تھے
لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھا رہے تھے۔
لیکن پردۂ سیمیں پر وہ مناظر کہیں نہیں تھے - جن میں بے آبرو ہو کر ننگی بھاگتی ہوئی ایشر کور کا سبز دوپٹہ لہرا رہا تھا - فاخراں منزل جل رہی تھی شیر محمد تڑپ رہا تھا - پاکستان پارلیمنٹ کے اجلاس کی کارروائیاں اور بڑے بڑے رہنماؤں کے مجسمے دکھائی دے رہے تھے - مگر فاخراں منزل کے شعلے اور ایشر کور کی لہو میں ڈوبی ہوئی انگلی سے لکھے ہوئے حروف کیمرے کی نظروں سے اوجھل تھے اگر کچھ لکھا ہوا تھا تو صرف یہی لکھا ہوا باقی تھا

ہندوستان زندہ باد ،

پاکستان زندہ باد ،

ہندوستان زندہ تھا - اور لاکھوں ہندوستانی مر چکے تھے - پاکستان زندہ تھا - اور لاکھوں پاکستانی اپنی آنکھوں سے پاکستان نہ دیکھ سکے تھے حالانکہ انھوں نے پاکستان کے لئے حسب حیثیت چندے دئے تھے - لہو دیا تھا - نمازیں پڑھی تھیں - دعائیں مانگی تھیں - اپنی عورتوں کی عصمت دی تھی - اپنی عورتوں کا سہاگ دیا تھا - برسوں سے اکٹھی کی ہوئی مکان کی اینٹیں

دی تھیں۔ دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کاٹ کر دی تھیں۔

اور جو اپنی آنکھوں سے پاکستان دیکھ رہے تھے۔ وہ پاکستان کو نہیں بلکہ شیر محمد کو ڈھونڈ رہے تھے۔ سہاگ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ سر چھپانے کے لئے مکان ڈھونڈ رہے تھے۔ ننگی چھاتیاں چھپانے کے لئے دوپٹہ ڈھونڈ رہی تھیں روٹی ڈھونڈ رہے تھے۔ پانی ڈھونڈ رہے تھے۔ پیسہ ڈھونڈ رہے تھے۔ زندگی ڈھونڈ رہے تھے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بابو دین محمد کو بڑے ڈاکخانہ میں ڈاکیہ کی نوکری مل گئی۔ پینتیس سال تک ڈسٹرکٹ کمشنر آفس میں ہیڈ کلرکی کرتے کرتے بابو دین محمد کو ترقی ملی۔ تو وہ ڈاکیا بن گیا۔ اور ڈاکیا بنتے ہی بابو دین محمد نے پنشن حاصل کرنے کے خیال کو دل سے ایسے ہی نکال دیا تھا۔ جیسے آزادی نے اسے ذاتی مکان فاخراں منزل سے باہر نکال دیا تھا۔ بابو دین محمد کی عمر اب پینسٹھ سال کے قریب تھی۔ اور غلامی کا عشق جیسے اس کے لہو کی بوند بوند میں رچا ہوا تھا اسی لئے تو وہ ڈاکیا بن گیا۔ اور اب پینسٹھ سال کی عمر میں گویا اس کی زندگی از سر نو شروع ہوئی ہو۔ جیسے اسے ایک بار پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر اٹھارہ سال کے بعد ایک نیا اور ذاتی مکان تعمیر کرنا ہو۔ جیسے فاخراں کی ایک اور شادی کرنی ہو

جیسے ابھی اور پینسٹھ سال تک اسے جینا ہو۔ جیسے زندگی ہی ابھی شروع ہوتی ہو۔

آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے کے بعد، کڑاہی سے نکل کر چولہے میں گرنے کے بعد زندگی دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ لامتناہی چکر...

شاکراں فکرمند نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا کرتی اور رو دیتی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد بھی وہ کوئی حل تلاش نہ کر سکی۔ کہ فاخراں کو اس کی نئی سہیلی بیوگی یا پرانی سہیلی الیننر کور سے کس طرح الگ رکھا جائے۔ آخر کس طرح۔" ایک رات عام ماؤں کی طرح اس نے بابو دین محمد سے ذکر چھیڑ ہی دیا کہ خدا کے لئے کچھ کرو۔ مجھ سے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی، وہ مر جائے گی ــــ للہ اسے بچاؤ کچھ کرو۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔

ایک دن بابو دین محمد تانگے پر گھر لوٹا

ساتھ سردار محمد نہیں تھا۔ ساتھ شیر محمد نہیں تھا۔ بلکہ ساتھ ایک سکنڈ ہینڈ "سنگر مشین" تھی۔ بابو دین محمد نے اپنی بیوی کے طلائی کنگن اور بیٹی کے زمرد دین بندے بیچ کر ایک کباڑئے سے ڈیڑھ سو روپئے میں یہ سنگر مشین خریدی تھی تاکہ فاخراں دن بھر مشین چلاتی رہے۔ سینے پرونے کے کاموں میں اپنا دکھ بھلا دے ایک مشین کو دوسری مشین کا سہارا مل جائے۔ کپڑے اور دکھ دونوں کٹتے رہیں

یہ مشین بھی جیسے بیوہ تھی کیونکہ اس پر سفیدے سے انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا ——

"سیتارام ٹیلر ماسٹر"

یہ دونوں بیوہ ہیں !

یہ دونوں مشینیں !!

مشین چلنے لگی۔ محلے کے سارے لوگ بابو دین محمد کے گھر سے واقف ہونے لگے۔ کیونکہ بابو دین محمد گھر گھر خیر خبر پہونچانے والا ڈاکیہ تھا۔ اور اسکی بیوی اور بیٹی بڑی ملنسار۔ محلے بھر کی عورتوں کی خدمت گزار ہونے کے علاوہ نہایت سستے داموں پر بچوں اور عورتوں کے کپڑے سی دیا کرتی تھیں۔

لیکن پڑوس کے نواب زادہ عبدالستار کی حمیرخ بیوی بڑی بد دماغ تھی اس کو نہ فاخراں سے کپڑے سلوانے تھے۔ اور نہ ان سے میل جول کی ضرورت تھی۔ پھر بھی وہ فاخراں کے گھر چلی آئی۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اس مکان میں کتنے کمرے ہیں اور سکھ مالک مکان کا کتنا سامان ہے۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ اس گھر میں سات کمرے ہیں۔ اور سکھ مالک مکان کا سارا فرنیچر جوں کا توں موجود ہے، ریڈیو سٹ سے لیکر سنگر مشین تک سبھی کچھ ہے اور بابو دین محمد صرف ایک

ڈاکیہ ہے۔ تو اسے محکمۂ آباد کاری کے سارے افسروں پر غصہ آنے لگا کہ وہ کتنے اندھے ہیں ایک دنی ڈاکیے کو اتنا بڑا سجا سجایا مکان دیدیا۔ نواب زادہ عبدالستار نہ صرف ڈی سی آفس کا ایک گزیٹڈ افیسر تھا۔ بلکہ ایک ایم۔ ال۔ اے کا سگا بھائی اور محکمہ آباد کاری کے ایک بڑے افسر کا ہم زلف بھی تھا۔ اسی لئے ایک رات نواب زادہ عبدالستار کے گھر بڑے بڑے افسروں کی بیویاں دعوت کھانے لگیں۔ اور بڑے لوگوں اور شریف لوگوں کی حق تلفی پر بڑی دیر تک بحث کرتی رہیں۔ کیونکہ پاکستان میں تو پہلے بڑے لوگ اور شریف لوگ ہی داخل ہوئے تھے۔ وہ پاکستان اسپیشل میں بیٹھ کر نہیں بلکہ ہوائی جہاز میں اڑ کر پاکستان میں سب سے پہلے داخل ہوئے تھے۔ اس لئے پاکستان کی ہر چیز پر پہلے انہی کا حق تھا۔

چنانچہ دوسرے دن ہی محکمۂ آباد کاری کا ایک نوٹس بابو دین محمد کے دروازے پر لگ گیا کہ تین دن کے اندر مکان خالی کر دو۔ ورنہ تحت قانون فلاں مجریہ محکمہ آباد کاری حکومت پاکستان بذریعہ پولیس مکان خالی کر دایا جائے۔"

تین دن تک بابو دین محمد دفتروں اور صاحب لوگوں کی کوٹھیوں کے درمیان بھاگتا رہا۔ مگر وہ ایک دنی ڈاکیہ تھا۔ یوں ہی بکتا تھا کہ وہ انبالے میں دسٹرکٹ کمشنر آفس کا ہیڈ کلرک تھا۔ بھاگو یہاں سے —— بابو دین محمد

بھاگا اور بھاگتا رہا۔

(۶)

چوتھے دن محکمۂ آبادکاری کے ایک انسپکٹر کے ساتھ پولیس کے چار سپاہی بھی اس کے گھر گھس آئے۔ اور شاکراں اور فاخراں برقعے اوڑھ کر باہر سڑک پر آگئیں۔ بابو دین محمد نے جب ڈیڑھ سو روپے میں خریدی ہوئی سنگر مشین اٹھانی چاہی۔ تو پولیس کے سپاہی نے اسکو ڈانٹا۔

"اے رکھ دے اسے یہ کہاں اٹھائے جا رہا ہے۔"

بابو دین محمد نے کہا

"یہ میری ہے جناب۔ یہ میں نے یہاں آکر خریدی ہے۔ اپنی بیٹی کی بیوگی کے دکھ دور کرنے کے لئے ڈیڑھ سو روپے میں خریدی ہے —— اپنی بیوی کے کنگن اور بیٹی کے بندے بیچ کر خریدی ہے۔"

محکمۂ آبادکاری کے انسپکٹر نے پوچھا ——

اس کی خریداری کی رسید کہاں ہے؟"

دین محمد نے کہا ——

رسید! رسید کہاں ہے!! رسید تو نہیں ہے!!!

انسپکٹر نے کہا —

"تو پھر رکھ اسے۔ یہ ہندوؤں سے لوٹی ہوئی مشین معلوم ہوتی ہے

نواب زادہ عبدالستار محکمۂ آبادکاری کے افسر کو پانچ سو پچپن کا

سگرٹ آفر کرتے ہوئے بولا —

"اور — اور جی ایک ڈاکیہ بھلا ڈیڑھ سو روپے کی مشین خرید سکتا ہے

جھوٹ بکتا ہے سالا۔

دین محمد گڑگڑانے لگا۔

خدا کی قسم۔ قرآن مجید کی قسم۔ رسول اللہ کی قسم۔ یہ میری ہے میں نے

اسے خریدا ہے۔ انسپکٹر صاحب للہ میری بیٹی کی بیوگی پر رحم کرو۔ اے حوالدار

صاحب خدا کے لئے رسول کے لیئے۔

مملکت خداداد کے محکمۂ آبادکاری کے انسپکٹر صاحب تانگے پر بیٹھ گئے

اور پولیس کے سپاہی سائیکلوں پر سوار ہو گئے — خدا کی قسم رسول اللہ

کی قسم ......

دین محمد گڑگڑاتا ہوا پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور شاکراں اور فاخراں اسکے

پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔

گول باغ کے بیچ راہے پر پہنچ کر شاکراں اور فاخراں محکمہ آبادکاری کے اس بورڈ کے پاس تھک کر بیٹھ گئیں۔ جس پر ایک خانماں برباد مرد اور عورت کی تصویریں تھیں۔ اور نیچے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"ان کو آباد کرنا آپکا قومی فرض ہے۔"

اور یہ بورڈ گول باغ کے بیچ راہے پر لگا ہوا تھا۔ جہاں ایک سڑک بھاٹی گیٹ کو جاتی ہے۔ دوسری گورنمنٹ کالج کو جاتی ہے۔ تیسری مال روڈ کو جاتی ہے۔ چوتھی گوجرانوالے کی طرف جاتی ہے۔ پانچویں لاٹ صاحب کے دفتر کو جاتی ہے۔ اور چھٹی سڑک ....

بابو دین محمد پاکستان کی تلاش میں شاید چھٹی سڑک پر چلا گیا تھا۔ کیونکہ اس نے پاکستان کو چندے دئے تھے۔ اٹھارہ سال سے جمع کی ہوئی مکان کی اینٹیں دی تھیں۔ بیٹی کا سہاگ دیا تھا۔ ایک سنگر مشین دی تھیں۔ اب اسے پاکستان سے سنگر مشین کی رسید وصول کرنی تھی۔ محکمہ آبادکاری کے سب سے بڑے افسر سے ملنا تھا کیونکہ گول باغ کے بیچ راہے پر دو بیوہ عورتیں .....

گول باغ کے بیچ راہے پر دو بیوہ عورتیں بھیک مانگنے کے جرم میں دھر لی

گئیں۔ اور ایک بیوہ رو رو کر چیخ چیخ کر بابو دین محمد کو پکارنے لگی ـــ آؤ لوٹ آؤ
ہمیں بچاؤ ہمیں چھڑاؤ۔......

بیوقوف عورت۔ آزاد ملک میں ملکِ خداداد پاکستان میں بھیگ مانگنا
جرم ہے۔ اور دین محمد ـــ وہ تو محکمہ آبادکاری کے سب سے بڑے افسر کے پاس
گیا ہوا ہے۔ اس کا دفتر بہت دور ہے چھٹی ٹھرک کے سب سے آخری منزل پر واقع
ہے۔ چیخنا چلانا بیکار ہے۔ تیری آواز اور کسی کی بھی آواز وہاں تک نہیں پہنچ
سکتی۔ چیخنے اور چلانے سے پاکستان کا دروازہ نہیں کھلے گا

اور کیا کسی غریب بھکاری کی دستک پر کسی عالیشان محل کا دروازہ
کبھی کھلا ہے۔ اور کبھی کھل سکتا ہے؟؟

منزل ہے کہاں تیری

خوبصورت ـــــ بے حد خوبصورت ایسی بھرپور جوانی کہ جالندھر
کے سارے نوجوان اسے پیاسی پیاسی لالچی نظروں سے گھورا کرتے تھے
وہ کون تھی ـــــ ؟ حسین عورت سے تعارف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ
اپ ہی اپ خودبخود متعارف ہو جاتی ہے۔ حسن کبھی غیر متعارف نہیں رہتا
چنانچہ مجھے بھی خود معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مس زہرہ شیر جنگ ہے۔ نواب
شیر جنگ کی اکلوتی بیٹی۔ نواب شیر جنگ جو پنجاب کے جاگیرداروں اور سرمایہ
داروں میں رئیس اعظم کا درجہ رکھتا تھا ـــــ اسی لئے میں اور راجیت سنگھ
اور مسعود اور ادم پرکاش اور متوسط طبقے کے بہت سے رومنٹک مزاج
نوجوان اسے صرف پیاسی پیاسی لالچی نظروں سے ہی گھورا کرتے تھے۔ اسکے سوا کچھ نہیں

اس کے آگے کچھ نہیں۔

دہلی لاہور، راولپنڈی، سیالکوٹ، سری نگر اور پشاور کے کئی رئیس زادے اس کی بارگاہِ حسن میں آئے مگر مایوس لوٹ گئے۔ اور یہ بات عام ہو گئی کہ مس شیر جنگ کی زندگی میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مس شیر جنگ میں مطلق سکس (SEX) نہیں ہے۔ مس شیر جنگ ایک ٹھنڈی لڑکی ہے۔

مگر مس شیر جنگ کی زندگی میں ایک مرد تھا۔ محمد اسحاق، یا صرف اسحاق یا سادہ کا —— شہر کے نوجوان اسحاق کو رشک۔ رقابت اور حسد میں ملی جلی، نظروں سے دیکھا کرتے کہ اسے مس شیر جنگ کا قرب حاصل ہے۔ اسے مس شیر جنگ کا تبسم عنایت ہوتا ہے۔ اس کے میٹھے میٹھے قہقہے نصیب ہیں۔ وہ اس کے بلوریں چمکدار جسم اور جھل مل جھل مل ریشمی کپڑوں اور خوشبوؤں کے ہالے میں رہتا ہے وہ اس سے باتیں کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کار میں اس کے پہلو میں بیٹھتی ہے

اسحاق ایک نوجوان تھا اور مس شیر جنگ کی زندگی میں اس کا رشک آمیز حد تک قرب لوگوں کے لئے ایک موضوع بحث یا اسکینڈل تو بن سکتا تھا۔ مگر نہیں بنتا تھا۔ کیونکہ مس شیر جنگ ایک رئیس زادی تھی۔ اور اسحاق اس کی سبز، چمکیلے رنگ کی پیکارڈ کا ڈرائیور تھا —— صرف ایک نوکر۔

اسی لئے مس شیر جنگ کے آگے اسحاق کے وجود میں ایک مرد پر ایک ملازم ایسا حاوی رہتا کہ اوّل الذکر شخصیت بالکل معدوم ہو کر رہ جاتی ——— محبت اور جنسی تعلقات میں بھی طبقاتی تفریق اس شدت سے کار فرما ہوتی ہے کہ مس شیر جنگ اپنے باپ کے کسی نوجوان دوست سے پردہ یا کم از کم حجاب تو کرتی تھی مگر اسحاق سے ——— نوکر سے بھلا کہیں حجاب یا پردہ ہوتا ہے۔ مس شیر جنگ اسحاق کے ساتھ کار میں اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ مگر وہ اونچ نیچ وہ فاصلہ جوں کا توں برقرار ہے جس کی بدولت زہرہ ایک نوجوان لڑکی نہیں مس شیر جنگ ہی اور اسحاق ایک نوجوان مرد نہیں ——— صرف ڈرائیور ہے ——— صرف ایک ملازم ہے ——— صرف ایک نوکر ہے۔

اس کے باوجود زہرہ سچ مچ اسحاق کو بہت چاہتی تھی۔ اسکی یہ چاہت عام لوگوں کو تو نہیں البتہ اسحاق کو ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا کئے ہوئے تھی ایک بار جب نواب شیر جنگ نے ایک دن کی غیر حاضری پر برآفروختہ ہو کر اسحاق کو نوکری سے نکال دیا تھا تو زہرہ نے رو کر ضد کی تھی۔ اور اسحاق کو دوبارہ نوکر رکھ لیا تھا۔ ایک بار اور اسحاق کو معمولی سا بخار آگیا تھا تو زہرہ دن میں تین بار ڈاکٹر لئے اس کے گھر پہنچی تھی ——— اسحاق اکثر مجھ سے اور دوسرے گھر سے

دوستوں سے پوچھا کرتا تھا کہ بتاؤ آخر —— یہ الطاف وعنایات ومدارات آخر کس لئے ——!! اس کے بعد وہ خود ہی مسکرا دیتا۔ جیسے سب کچھ جانتا ہو۔ لیکن اس کا بے تکلّف دوست اُجل سنگھ جو ٹیکسی کا چلایا کرتا تھا۔ اسے گویا بڑے مشفقانہ لہجے میں نصیحت کرتا تھا "سالے —— یہ تیری بیوقوفی ہے تیرا اس کا کیا ساتھ۔ ایسی سالیاں تو ہم لوگوں سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں جیسے اپنے کتوں سے کرتی ہیں —— میں ——مجھے دیکھ، بمبی میں ایک سالی ایکٹریس کی کار چلاتا تھا، وہ بھی مجھ سے ایسا ہی پیار کرتی تھی —— ایک دن میں "آؤٹ" ہو گیا تو صاف صاف فرنٹ ہو گئی اور غصّے میں بولی —کمینے کتے تیری یہ مجال !! نکل جا میرے گھر سے۔"

جمال دین حلوائی کہا کرتا "اپنی بیوی بچوں کا کچھ خیال رکھ سالے ....
تیری بیوی روز میری بیوی سے شکایت کرتی ہے کہ اب تو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ اس کا اور بچے کا کوئی خیال نہیں کرتا —— پچھلے دنوں تیرا بچہ اتنا بیمار رہا مگر تو تھا کہ بس بی بی جی —— بی۔ بی۔ جی —— دیوانہ ہو گیا ہے تو تو۔"

میں —— اسحاق کے سارے دوستوں میں سب سے زیادہ ہا

پڑھا لکھا تھا۔ اور اسحاق میری بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ لیکن بی بی جی کے معاملے میں گویا میری نصیحتیں بھی اسکے لئے گونگے کی نصیحتیں ہوتی تھیں۔ میں اسے یوں نصیحت کرتا گویا مجھے اسے راہ راست پر لانا نہیں ہے۔ بلکہ میرے پڑھے لکھے ہونے کے اس رعب کو اور مستحکم کرنا ہے۔ جو اس پر اجل سنگھ پر، جمال دین حلوائی پر اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں پر میں نے طاری کر رکھا تھا۔ میں اس سے یوں کہا کرتا "دیکھ ساہکے —— تو ایک غریب آدمی ہے اور زہرہ ایک امیر لڑکی ہے۔ وہ ایک جاگیر دارنی ہے۔ اور تو ایک نوکر —— وہ جاگیر داری ہے اور تو انسانیت —— جاگیر داری بالکل اسی طرح انسانیت کا لہو پیتی ہے جس طرح زہرہ تیرا لہو پیتی ہے —— میں زہرہ کو ایک لڑکی یا عورت نہیں سمجھتا بلکہ اسکو جاگیر داری سمجھتا ہوں۔ اس کو ایک طبقہ سمجھتا ہوں، اس کو ...."

لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اجل سنگھ کسی نہ کسی مسخرے پن سے میری بات ختم کر دیتا، ویسے ہی میری علمیت اور قابلیت کا رعب ان لوگوں پر تھا۔ مگر وہ میری علمیت اور قابلیت سے ایک دو لمحوں ہی میں بیزار ہو جاتے تھے۔

رہا اسحاق ـــــ میں اسکو کہاں راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اس غلط فہمی یا مغالطہ میں برابر پھنسا رہے، کوئی کیوں بھلا ناصح بن بیٹھے۔ جب زندگی خود سب سے بڑی ناصح ہے۔ ایک دن جب اسحاق نے مجھ سے یہ کہا " بابوجی ـــــ یہ اُجل سنگھ اور جمال دین، یہ دونوں سالے بکتے ہیں، بات تو کچھ اور ہی ہے۔ خدا کی قسم بابوجی ـــــ زہرہ بی بی میرے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتی ـــــ مجھ میں آخر کیا کمی ہے جی ـــــ اچھی شکل صورت ہے۔ سوٹ بوٹ پہن لوں تو پورا اشوک کمار معلوم ہونے لگوں ـــــ اچھا جسم رکھتا ہوں۔ یعنی بہت اچھا ـــــ سمجھ رہے ہو نا؟...... اب یہی دیکھو یہ تا جان ـــــ میری بیوی بغیر نکا کے اپنا گھر بار چھوڑ کر میرے ہاں چلی آئی کہ بس کچھ نہیں ـــــ باندی بنا کے رکھ لو۔"

میں نے اس کے کندھے تھپک کر اس سے کہا " چل چل رے نوجوان ـــــ" رکنا تیرا کام نہیں ہے چلنا تیری شان، یہ اجل سنگھ اور جمال دین تو بیوقوف ہیں۔ ان کی باتوں کی پروا نہ کرو۔"

اس نے کہا " مگر بابوجی ـــــ معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے مگر وہ لائن پر نہیں آتی ابھی ـــــ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ آخر مجھ سے چاہتی کیا ہے!"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہمت نہ ہار نامیرے دوست آجائے گی لائن پر بہت جلد تجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ ...."

آخر ایک دن اسے معلوم ہو ہی گیا - بڑی گرم بڑی لمبی بڑی سنسان دوپہر تھی - بی بی محل میں نے اسے بلایا - بی بی جی بہت غصے میں تھی - جانے اسحاق سے کیا حرکت سرزد ہو گئی کہ وہ فرط غضب سے کچھ نہ بولی کچھ نہ بول سکی بس لہو کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کے رہ گئی -

اس دن اسحاق بہت خوش تھا اتنا خوش کہ نواب سیر جنگ یا زہرہ بی بی کی اجازت کے بغیر گیراج سے کار نکال کر وہ جالندھر کی سڑکوں پر اکیلا گھومتا رہا راستے میں ایک جگہ اتنے میں اور راجل سنگھ ملے اس نے ہمیں پر ینیم ہوٹل میں بہت کچھ کھلایا پلایا - اس کے بعد کار میں سیر کرائی - لیکن وہ جمال دین حلوائی سے سخت ناراض تھا کیونکہ ناجاں اس کی بیوی کے پاس اپنے دکھڑے اور اسکے ظلم کی داستانیں سناتی ہے، اور یہ جمال دین سارے لوگوں میں بیٹھ کر اسحاق کو گالیاں دیتا ہے - جیسے بڑا حق دوستی ادا کر رہا ہو —— ابھی لال کرتی بازار سے آتے ہوئے وہ ملا تھا - اس نے کہا تھا بیٹا بہت عیش کر رہے ہو —— ذرا گھر جا کے دیکھو —— تمہارا بچہ سد یک بیمار پڑا ہے - بیچاری ناجاں دوائی

کے لئے کہاں کہاں ماری پھرتی ہے۔

صدیق کی بیماری نے جیسے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ اسحاق اسے دیکھنے اور اس کی تیمارداری کرنے کے لئے گھر تو گیا مگر اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اس نے صدیق کو پیدا کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے تاجاں سے شادی کر کے سخت حماقت کی ہے۔

صدیق کے صحت یاب ہونے کے بعد اسحاق گھر سے پھر لاپروا ہو گیا تاجاں اپنے شوہر کی اس بے التفاتی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی وہ صرف روتی تھی کچھ نہ کہتی تھی۔ آنے کے بعد وہ تاجاں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا ــــ گھر میں داخل ہوا۔ روٹی مانگی۔ چپ چاپ روٹی کھائی باہر چلا گیا۔ باہر سے آیا۔ سو گیا۔ جاگ اٹھا۔ پھر باہر چلا گیا۔ باہر باہر باہر ــــ!! جیسے دنیا باہر ہے۔ اندر کچھ نہیں تھا۔ صدیق اس کی طرف رینگتا رینگتا بڑھتا۔ مگر پہلے کی طرح اب وہ اسے گود میں نہیں اٹھاتا تھا۔ بازار لے جا کر مٹھائی، بسکٹ، پیپرمنٹ، کچھ نہیں دلاتا تھا۔ وہ رونے لگتا تو جاں کو ڈانٹ دیتا ــــ" اسے، سنتی نہیں ــــ یہ کتنی دیر سے رو رہا ہے۔ کیوں رو رہا ہے یہ ــــ کیا اس کا باپ مر گیا ہے ــــ دودھ پلاؤ اسے۔ چپ کراؤ اسے۔" اور جب وہ

چپ نہ ہوتا تو چلا کر گھر سے باہر چلا جاتا۔

اب روز بروز وہ بڑا آدمی بنتا جا رہا تھا۔ زہرہ بی بی کی مہربانی سے اس کی تنخواہ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ تیس روپے کا نوکر تھا۔ پھر دس روپے اور بڑھ گئے۔ اس کے علاوہ انعام اکرام۔ زہرہ بی بی جب اپنے لئے کپڑے خرید رہی تھی تو اس نے اسحاق کے لئے بھی ولائتی سلک کی دو قمیضوں کا کپڑا خریدا تھا۔۔۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور بھی اچھے اچھے کپڑے تھے دو گرم پتلونیں۔ چار ٹھنڈی پتلونیں، چار قمیضیں، ایک فلیکس شوز، ایک باٹا کا سنڈل۔۔۔ روز بروز وہ ڈرائیور کے بجائے کچھ اور بنتا جا رہا تھا۔ روز بروز تاجاں بدصورت ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ پھر ذرا جاگیرداری غریبی کا لہو پیتی رہی پھر روزانہ تاجاں کا سہاگ مرجھا نا گیا۔۔۔ ایک گھر کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں دو ننھی باہیں پھیل پھیل کر اس کی طرف بڑھتی رہیں مگر فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بس زہرہ شیر جنگ کے گالوں کے گلاب سرخ ہوتے گئے۔ نکھرتے گئے اور ادھر تاجاں کے آنسو شبنم کی چمکیلی بوندوں کی طرح ٹپکتے رہے، گرتے رہے۔

اسحاق کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان ہر دم ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سدا

رونے والی آنکھوں سے دور بھاگ جائے۔ بس زہرہ شیر جنگ کو اس کی سبز چمکیلے رنگ کی کار میں بیٹھ کر ڈرائیو کرتا ہوا چہار باغ سے دور، امپیریل باغ سے دور کسی انجانے کسی اجنبی کسی اور باغ میں لے جائے، بھاگ جائے کیونکہ سارا جالندھر نواب شیر جنگ کا ہے۔ اس وقت تک وہ صرف ایک ڈرائیور ہی صرف ایک ملازم صرف ایک نوکر۔ اس کی یہ سماجی حیثیت تبھی ختم ہو سکتی ہے جب کہ وہ جالندھر سے دور کہیں چلا جائے ——؟

ایک دن، اسحاق کی یہ تمنا، یہ خواہش، یہ دعا جیسے خود بخود پوری ہو گئی نواب شیر جنگ سے بھی ایک بڑے آدمی نے، دہلی کے انگریز لاٹ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کر دیا کہ جالندھر نواب شیر جنگ کا نہیں، بلکہ جالندھر سیٹھ رام کشن داس اور سردار گورکھ سنگھ جی کا ہے۔ جالندھر مسلمانوں کا نہیں۔ جالندھر ہندوؤں اور سکھوں کا ہے۔ مسلمانوں کو مارو، مسلمانوں کو نکالو، مسلمانوں کو بھگا دو۔ مسلمان جالندھر سے بھاگنے لگے۔ مسلمان گذرنے لگے مسلمان مرنے لگے —— جمال دین حلوائی بڑا گھبرایا ہوا، سہما ہوا، اپنی بیوی اور اسحاق کی بیوی کو ساتھ بھاگ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ مگر ادھر چہار باغ کی عالیشان کوٹھی میں مس زہرہ شیر جنگ مسکراتے ہوئے اسحاق سے کہہ رہی تھی "ساتھی —— ہم لاہور

جا رہے ہیں، تم نے کبھی لاہور دیکھا ہے ——— بڑا خوبصورت شہر ہے، بڑا
بیوٹی فل بڑا رومانٹک شہر ہے ——— لاہور مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے لاہور
جانے کی اتنی خوشی ہے کہ بس ——— اچھا دیکھو تمہیں بھی ہمارے ساتھ
چلنا ہوگا۔"

اسحاق نے کہا "بی بی جی ——— میں اپنی بیوی اور بچے کو بھی لے
آؤں۔" مس شیر خبگ نے کہا "ارے بیوقوف ——— ہم تو اپنی کار میں
جا رہے ہیں۔ کار میں اتنی جگہ کہاں ہوگی؟ میں ہوں، ہماری ڈیڈی ہیں اور
میرا بل ڈاگ ——— ضرورت کا تھوڑا بہت سامان ——— تم ہمیں لاہور
چھوڑ کر کل واپس آجانا اور انہیں لے جانا۔"
اسحاق نے کہا۔ "مگر بی بی جی ——— ایسی حالت میں میں انہیں اکیلا چھوڑ
کر کیسے جا سکتا ہوں۔"
مس شیر خبگ نے پر فریب مسکراہٹ میں جواب دیا۔ "وہ تم فکر نہ کرو۔
ڈیڈی نے ابھی سیٹھ رام کشن داس جی کو بلایا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ
وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت میں ہمارا سامان اپنی لاری کے ذریعے بھجوا
دیں گے۔ میں سیٹھ رام کشن داس کو بھی ابھی ٹیلیفون کئے دیتی ہوں کہ وہ کل لازمی

ساتھ تمہارے بیوی اور بچے کو بھی لاہور پہونچا دیں۔ تم اب گھر جاؤ اور ان سے مل آؤ۔"

میس شیر جنگ نے ٹیلیفون کا ڈائل گھمایا۔ اور جیسے تاجاں کی دنیا گھوم گئی۔ تاجاں رونے لگی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی ۔۔ میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ ابھی ابھی غنڈے جمال دین کی بہو کو اٹھا کر لے گئے، جمال دین مارا گیا ۔۔ میں، میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" ۔۔ اسحاق غصے سے بولا" اری پگلی ۔۔ بی بی جی نے سب انتظام کر دیا ہے" میں ابھی تجھے سیٹھ رام کشن داس جی کے گھر چھوڑ دونگا۔ اور کل واپس آجاؤں گا۔۔ سیٹھ جی کے گھر میں کوئی سالا تیری طرف بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنا ہی گھر ہے۔

مگر تاجاں اس کے پیروں پر گر پڑی" خدا کے لئے نہ جاؤ ۔۔ تمہیں میری قسم، تمہیں اس ننھے کی قسم ...... "

اسحاق غصے سے بولا" تیری عقل ماری گئی ہے ۔۔ اگر میں صاحب کے ساتھ نہیں گیا۔ تو میری نوکری چلی جائے گی۔ اور میں نمک حرام نہیں ہوں کہ ایسے برے وقت میں ان کی خدمت نہ کروں ۔۔ میں جب سے بک رہا

ہوں کہ میں کل واپس آجاؤں گا۔ اور تجھے لے جاؤں گا — مگر تیری سمجھ

میں کچھ آئے گا بھی —!!

نوکری اور بیوی — پچاس روپے تنخواہ اور بیوی سندر اور

تاجاں..... تاجاں پھوٹ پھوٹ کر رونی رہی مگر اسحاق نے اسے اور،

بچے کو سیٹھ رام کشن داس جی کے سرونٹ کوارٹر میں چھوڑ کر سبز چمکیلے رنگ

کی پیکارڈ اسٹارٹ کر دی۔

پھر کار کے پیچھے اڑتی ہوئی گرد اور دھول میں جالندھر جیسے ہمیشہ کے

لئے نظروں سے چھپ گیا۔

چار گھنٹے بعد جالندھر سے بیس میل دور چودہ پندرہ اکالی سکھوں

اور راشٹریہ سیوک سنگھیوں کے مشتعل غول نے سبز رنگ کی چمکیلی پیکارڈ

روک لی — نواب شیر جنگ کار کی سیٹ کے نیچے اوندھے منہ گر پڑے

ممابے ہوش ہو گئیں — ایک غنڈے نے مس زہرہ شیر جنگ کا نازک

ہاتھ بڑی بے دردی سے پکڑ لیا۔ بلڈوگ زور زور سے بھونکنے لگا۔ اور

اسحاق بڑی بے باکی سے غنڈوں سے گتھ گیا۔ نواب شیر جنگ کے بارہ بور والے

پستول سے اس نے آٹھ غنڈے مار گرائے۔ باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور مس شیر جنگ

کا ہاتھ آزاد ہو گیا ۔

مگر چھ گھنٹے بعد ساٹھ میل دور جالندھر میں سیٹھ رام کشن داس جی کے سرونٹ کوارٹر میں تاجاں کا نازک ہاتھ موہن سنگھ چوکیدار کے مضبوط ہاتھوں سے آزاد نہ ہو سکا ۔ وہ تھک کر بے ہوش ہو کر گر پڑی ۔ ننھا صدیق دور زمین پر پڑا چیخ چیخ کر بلک بلک کر اسے ڈھونڈتا رہا ۔ لیکن موہن سنگھ کے ہیبت ناک جسم کے مہیب سایہ میں اسکی ماں اسکی ننھی ننھی آنکھوں سے اوجھل تھی ۔ چھپ گئی تھی غائب تھی ۔

اور مہر شام نواب شیر جنگ ، حما ، زہرہ ، بلڈاگ ، اور اسحاق لاہور کی ایک عالی شان کوٹھی میں آباد ہو چکے تھے ۔ اور سر شام سیٹھ رام کشن داس جی کا سرونٹ کوارٹر اُجڑ گیا تھا ۔ نواب شیر جنگ نے بہادری کے صلے میں ہیرے کی ایک بیش قیمت انگوٹھی انعام دی ۔ اور سیٹھ رام کشن داس جی کے سرونٹ کوارٹر میں ایک غریب عورت نے اپنی بے چارگی اور بے بسی کے باعث ایک انمول موتی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دیا ۔

دوسرے دن اسحاق نواب شیر جنگ کی دولت ، اس کا اسباب اور اس کا فرنیچر اور اپنی بیوی اور بچے کو لانے کے لئے پھر جالندھر پہونچا ۔ سامان

کی لاری بھری ہوئی تھی۔ سرونٹ کوارٹر خالی پڑا ہوا تھا۔ اسحاق کوارٹر کی تاریکی میں تاجاں کو اور صدیق کو، صدیق کو اور تاجاں کو بھیانک آواز میں پکارتا رہا۔ اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

لاری کا سکھ ڈرائیور جوگندر سنگھ اسحاق سے کہنے لگا۔ چلو جلدی کرو کوئی تمہیں پہچان لے گا تو تمہاری خیر نہیں ——— چلو جلدی۔ سارا سامان تو رکھا جا چکا ہے۔"

سامان!

تاجاں!!

نواب شیر جنگ کا سامان!

میرا بچہ!!

تاجاں اپنا سامان کھو چکی تھی۔ اسحاق اپنا سامان کھو چکا تھا۔ پھر بھی سامان کی لاری بھری ہوئی تھی۔ اسحاق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جوگندر ——— یار میں تاجاں کو ذرا اپنے گھر میں دیکھ لوں ——— تو مجھے مقیم پور سے ساتھ لے لے ——— میں جاتا ہوں۔"

جوگندر سنگھ نے کہا "ارے پاگل ——— وہاں تو اب کوئی مسلمان

نہیں جا سکتا۔ مار ڈالا جائے گا تو —— ہاں میں تجھے لاری میں مقیم پورے
لے جا سکتا ہوں۔ وہاں میں خود دیکھ آؤں گا۔ تو گاڑی سے نہ اتر۔"
اسحاق مقیم پورے نہیں جا سکتا۔ نواب شیر جنگ کے سامان کی لاری
مقیم پورے جا سکتی تھی۔ سیٹھ رام کشن داس جی، نواب شیر جنگ مما اور زہرہ
کو، ان کے اسباب کو جالندھر سے لاہور اپنے آدمیوں کی حفاظت میں بھیج سکتا
تھا۔ مگر اسحاق کی بیوی تاجاں کی عصمت نہیں بچا سکتا۔ جمال دین کو نہیں بچا سکتا
تھا۔ کیونکہ جالندھر میں ہندو مسلمانوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ جمال دین اور ژوہن سنگھ
کی لڑائی ہو رہی تھی۔ سیٹھ رام کشن داس اور نواب شیر جنگ کی لڑائی نہیں،
ہندو مسلمانوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔

نواب شیر جنگ کے اسباب کی لاری مقیم پورہ پہنچی۔ اسحاق کو اپنا گھر نظر
نہیں آیا۔ آگ ہی آگ نظر آئی۔ شعلے ہی شعلے نظر آئے۔ اسحاق دیوانہ
وار پکارنے لگا۔

تاجاں —— !!

آگ کوئی جواب نہ دے سکی۔

صدیق —— !!

شعلہ بالکل خاموش تھا۔

اسحاق سر جھکائے روتا ہوا نواب شیر جنگ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ از سرِ نو حق نمک ادا کرنے۔ وفادار نمک حلال اسحاق —— نواب شیر جنگ، نے، حمانے، زہرہ شیر جنگ نے۔ بڑے افسوس اور ہمدردی کے ساتھ اسحاق کی دردناک کہانی سنی اور پھر نواب صاحب حقہ پینے لگے حما سونے کے لئے بڈ روم میں چلی گئی۔ بی بی جی نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا

"اک بنگلہ بنے نیارا"

نئی جگہ اور نئے مکان کی وجہ سے بلڈاگ رات بھر بھونکتا رہا اور اسحاق رات بھر روتا رہا۔

دن گذرتے گئے۔ اسحاق کا رونا کم ہوتا گیا۔ لیکن دکھ بڑھتا گیا۔ کیونکہ اسحاق نے جس کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا۔ ایک عفت مآب بیوی اور ایک ننھا بچہ، ایک گھر ایک سچی محبت —— سب کچھ اجاڑ دیا تھا۔ اب وہ بھی اس سے دور دور ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ لاہور اسے بہت پسند تھا بڑا بیوٹی فل بڑا رومانٹک شہر —— اور پھر لاہور میں زہرہ کا کوئی چچازاد بھائی انتھی راچانک گویا آسمان سے ٹپک پڑا تھا یا زمین سے نکل آیا

تھا ـــــ افتخار روز بروز زہرہ کے قریب ہوتا گیا اور اسحاق روز بروز گیراج سے قریب ہوتا گیا۔ جالندھر میں وہ سوچا کرتا کہ اگر وہ جالندھر چھوڑ دے تو شاید اس کی سماجی حیثیت بدل جائے کیونکہ جالندھر نواب شیر جنگ تھا۔ مگر اب لاہور پہنچ کر بھی اس کی سماجی حیثیت جوں کی توں باقی رہی۔ کیونکہ لاہور بھی نواب شیر جنگ کا تھا ـــــ اسے بڑا غصہ آتا وہ بڑبڑاتا، کیا اتنی بڑی زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں جو نواب شیر جنگ کی نہیں ہے۔ اور جہاں وہ زہرہ کو ساتھ لے کر ڈرائیو کرتا ہوا ......

مگر افتخار ـــــ اسحاق کو افتخار کی صورت ہی سے نفرت تھی وہ چاہتا تھا کہ افتخار جہاں سے آیا ہے اسے وہیں پہنچا دے۔ ـــــ یا تو آسمانوں پر پھینک دے یا زمین میں دفن کر دے

ایک رات ـــــ آدھی رات گئے جب وہ زہرہ اور افتخار کو "اسٹیفلز کی رقص گاہ سے واپس لا رہا تھا تو چیرنگ کراس کی آسمانی رنگ کی روشنیوں کے اجالے میں اس نے سامنے لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے میں دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر صرف افتخار بیٹھا ہے ـــــ زہرہ، نہیں ہے پھر وہ اس آئینہ کو گھورتا ہوا اسٹیرنگ گھماتا رہا۔

زہر تھی۔

زہرہ نہیں تھی۔

زہرہ کبھی نظر آتی۔

زہرہ کبھی غائب ہو جاتی۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ اور اچانک اس نے محسوس کیا کہ کار ایک کھمبے سے ٹکرا گئی ہے —— بریک چیخ اٹھے —— زہرہ غصیلی آواز میں چیخی —— کیا تم سو گئے ہو گدھے —؟"

اسحاق نے دانت پیستے ہوئے پیچھے دیکھا۔ کار سچ مچ ایک کھمبے سے ٹکرا چکی تھی۔.......

ایک بڑی شاندار کوٹھی پر اقتدار کو چھوڑ کر جب اسنے کار پھر اسٹارٹ کی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ زہرہ سے کچھ پوچھے۔ لیکن زہرہ جیسے مسلسل اس کے کان میں چیخ رہی تھی۔

کیا تم سو رہے ہو گدھے ——؟

گدھے —— !!

اب فاصلہ بالکل واضح ہو گیا تھا۔ اسحاق کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا

ہے۔ مگر ماڈل ٹاؤن کی عالیشان کوٹھی کے پورچ میں کار روک کر وہ زہرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا —— بی بی جی —— میں افتخار سے آپکا ملنا جلنا بالکل پسند نہیں کرتا —— میں —— میں —— پھر تم نے میرے ساتھ مجھے تم نے اب تک کیوں دھوکے میں رکھا —— میں نے ...... تمہارے لئے اپنی بیوی اپنا بچہ اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا اور تم اب .....

اسحاق کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ پڑا۔ یہ طمانچہ اسی ہاتھ کا تھا جو نیند خواب گاہ میں اسحاق کی گردن پر سانپ کی طرح رینگتا رہا تھا۔ یہ طمانچہ اسی ہاتھ کا تھا جس نے تاجاں کی پیشانی سے جھومر اتار پھینکا تھا اسی نازک ہاتھ کا طمانچہ جسے جالندھر سے بیس میل دور اسحاق نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک غنڈے کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ اور یہی وہ ہاتھ تھا جو اب طمانچہ بن کر اسحاق کے گال پر سلگ رہا تھا۔

کوٹھی کے سب کمروں کی روشنیاں جاگ پڑیں۔ ڈیڈی، مما، نوکر چاکر سب پورچ میں جمع ہو گئے۔ مس زہرہ شیر جنگ غصّہ میں کانپ رہی تھی اور ڈیڈی کے سینے پر سر رکھ کر رو رہی تھی ——

"ڈیڈی، اس حرامزادے، کتے کمینے کو فوراً نکال دیجئے۔"

ڈیڈی غرّانے لگے۔ "نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کتّے!"

بلڈاک بھونکنے لگا۔

نکل جاؤ کتّے!

کتّے ——!!

پھر اسحاق کو اندھیرے میں دھکیل کر نواب شیر جنگ نے اپنی کوٹھی کا پھاٹک ہمیشہ کے لئے اس پر بند کر دیا۔ اسحاق نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کوٹھی کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا۔ جو جیسے ہم آواز ہو کر چیخ رہی تھیں —— بھاگ جاؤ نمک حرام —— بھاگ جاؤ کتّے۔"

مگر اسحاق اندھیرے میں چپ چاپ جہاں کا تہاں کھڑا تھا۔ جیسے ایک اندھیرے سے نکل کر دوسرے اندھیرے میں پہنچ کر اس کے پاؤں جو اب دے چکے تھے۔ سڑک کے کتّے جیسے کسی نئے کتّے کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگے۔ اسحاق نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ دکھائی دیا۔ آگے کوئی سڑک نہیں تھی۔ سارا ماڈل ٹاؤن، سارا لاہور سارا پاکستان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا ——

سزا

طلعت بڑی حیران تھی کہ اس کے شوہر کے پاس اچانک اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آگیا؟ ـــــ ایک دم دس ہزار روپے!! ایک معمولی بینک کلرک کے پاس جس کی تنخواہ صرف ایک سو پچیس روپے ماہوار ہو اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آسکتا ہے؟

شاہد نے جب طلعت کے ہاتھوں میں دس ہزار روپے کے کرنسی نوٹوں کی گڈیاں تھما دیں تو پہلے وہ انہیں سنبھال ہی نہیں سکی بالکل اسی طرح جیسے کسی غریب آدمی کی زندگی کے مسلسل نوحے میں کوئی مسرت بھٹک کر آجاتی ہے تو وہ مسرت سنبھالے نہیں سنبھلتی ہے۔ اور غریب آدمی بوکھلا جاتا ہے ـــ طلعت کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ اسکی نازک نازک ہتھیلیوں میں

نوٹوں کی گڈیاں سما ہی نہیں سکیں۔ چند ادھر ادھر گر پڑیں ـــ طلعت ہنس پڑی
خوشی اچانک اس کے جسم میں اس طرح سما گئی تھی کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے
اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گال سرخ ہو گئے تھے اور دماغ چند
لمحوں کے لئے سُن ہو گیا تھا۔ جب خوشی کا غلبہ ذرا کم ہوا اور دماغ کچھ سوچنے کے
قابل ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس نے شاہد سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ یہ سرِ شام اتنے
بہت سے روپے کہاں سے ہاتھ لگ گئے! جب کہ آج صبح ان کے گھر صرف
ایک روپیہ اور تین آنے باقی رہ گئے تھے جس سے گھر کے آٹھ افراد کے لئے
بمشکل صبح کی چائے پکائی تھی۔

روپے اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھتے ہوئے اس نے شاہد سے پوچھا
مگر یہ تو تم نے نہیں بتایا کہ روپے آئے کہاں سے ـــ؟

شاہد نے طلعت کے دونوں کندھے پکڑ کر میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہا ـــ

" تم بتاؤ یہ روپے کہاں سے آسکتے ہیں۔

طلعت نے شاہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک لمحہ کے لئے دیکھا
اور پھر اس کی ان تیز نظروں سے چھپ کر جو تنہائی میں طلعت کی پلکیں جھکا دیتی

تھیں۔ اور اس کے گالوں میں گلاب بھر دیتی تھیں۔ طلعت نے منہ بناتے ہوئے کہا

" اچھا اب سمجھی۔ یہ بینک کی رقم معلوم ہوتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح تم اسے رات

کی رات رکھو گے اور صبح دفتر جاتے ہوئے کہو گے —— ہاں ہاں ڈیئر طال۔

—— لاؤ نا وہ روپئے جو میں نے کل تمہیں رکھنے کے لئے دئے تھے۔ فرض کرو اگر،

کل میں یہ روپے واپس نہ کروں تو —— ؟ شاہد نے کہا

" تمہیں میری جان کی قسم ہرگز واپس نہ کرنا۔ یہ سارے کے سارے روپے بالکل

تمہارے ہیں۔"

طلعت نے کہا

" جاؤ بابو صاحب! منہ دھو آؤ، ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اب

میں چائے بناتی ہوں۔ چائے پیو، اور لمبے لمبے لیٹ جاؤ۔ ہم غریبوں کی قسمت

میں دس ہزار روپے کہاں لکھے ہیں۔ ؟"

طلعت نے یہ کہکر ٹھنڈی سانس لی تو شاہد نے کہا

" طالی۔ تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں ہے تم نے یہ ٹھنڈی سانس کیوں

لی! لیکن اب مطمئن رہو۔ اب تمہیں آئندہ کبھی بھی کوئی ایسی جلتی سانس لینے کی ضرورت

نہیں پڑیگی —— طالی پیاری! تم نہیں جانتیں کہ جب خدا کسی کو نوازتا ہے تو۔

چھپر پھاڑ کر نوازتا ہے۔ یہ تو تم مانتی ہونا ——— !"

طلعت بھلا یہ کیسے مانتی۔ عام پاکستانی عورت کی طرح وہ بھی خدا پر صد فیصد اعتقاد رکھتی تھی۔ لیکن وہ ذرا تفصیل سے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ چھپر کس طرح پھٹا یا پھاڑا گیا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی اور کچھ پوچھنا بھی چاہتی تھی کہ شاہد خود ہی بول پڑا

"طالی۔ تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ میں نے یا تو یونہی رعب جمانے کے لئے بینک کا سرکاری روپیہ تمہیں رکھنے کو دیا ہے یا پھر کسی کی جیب کاٹی ہے یا چوری کی ہے یا پھر......."

طلعت نے بڑے پیار سے اس کی ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی

"شش ——— ایسی باتیں سوچیں تمہارے دشمن۔ لیکن پھر بھی یعنی۔ ——— مگر......"

شاہد نے شریر نظروں سے طلعت کو دیکھتے ہوئے کہا

"یہ علی بابا چالیس چور کی کہانی رات میں سناؤں گا۔ اب تو تم پہلے مجھے چائے کی ایک پیالی دو۔ کیونکہ مجھے جلد ہی باہر جانا ہے۔ ایک دلال سے بات کی ہے وہ ہمیں تین ہزار روپے کی پگڑی پر آج شام یا کل صبح تک چار کمروں والا ایک

بہترین فلیٹ دلائے گا۔ اب ہم اس قبر نما مکان میں تو نہیں رہ سکتے نا۔ اب تو ہم بھی بڑے پیسے والے اور رئیس آدمی ہیں۔ طالی!

طلعت کو شاہد کی طبیعت کا پورا اندازہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنا ضدی اور شریر ہے۔ جب بھی کوئی بات اصرار کر کے اس سے پوچھی جائے تو وہ عمداً ایسی بات کو ٹال جایا کرتا تھا۔ اور اصرار نہ کیجئے تو وہ بغیر پوچھے ہی وہ بات بتا دیتا تھا۔ طلعت نے سوچا کہ اب رات میں کتنے گھنٹے باقی رہ گئے ہیں چلو یہ علی بابا والی کہانی رات ہی کو سہی!

شاہد چائے پینے کے بعد طلعت سے چار ہزار روپے لیکر گھر سے باہر نکل گیا اور طلعت کھڑکی میں سے اسے اسوقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ اگلے موڑ سے مڑ کر نظروں سے نہ چھپ گیا۔ طلعت دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ شاہد بخیر و عافیت اور صحیح سلامت گھر لوٹ آئے کیونکہ اس کی جیب میں چار ہزار روپے تھے۔ اور شہر میں جرائم کی حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ رہزن اور اچکے چند روپوں کی خاطر بھی کسی کو چھرا مار کر ہلاک کر دیتے تھے اس سے پہلے طلعت کو اپنے شوہر کی سلامتی کی دعائیں مانگنے کا خیال تک نہیں آیا تھا کیونکہ روز آنہ تو اس کی جیب میں پانچ چھ آنے سے زیادہ پیسے ہوتے ہی نہیں تھے

شاہد کے چلے جانے کے بعد جب وہ یہ خبر اپنی ساس نند اور دیور کو سنانے کے لئے دوسرے کمرے میں گئی تو معاً اسے خیال آیا کہ ایسی خوشی کی خبر شاہد نے آخر اپنی ماں اور بہن بھائی کو کیوں نہیں سنائی؟ جب وہ اس کے اپنے روپے ہیں تو اس کو چاہئے تھا کہ خوشی خوشی دندناتا گھر آتا اور سب کو جمع کر کے کہتا

سنو —— ایک خوشخبری سنو

مگر وہ تو بڑے رازدارانہ انداز میں صرف طلعت کو یہ خوشخبری سنا گیا آخر ایسی پردہ داری کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس کے چہرے پر بھی خوشی کی کوئی چمک نہیں تھی —— طلعت نے سوچا کہ جب اس کے شوہر نے خود ہی یہ خوشخبری اپنی ماں بہن اور بھائی کو نہ سنائی یا نہ سنائے۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور اپنی ساس کو ساری بات سنا ہی ڈالی۔ شاہد کی ماں ایک جہاندیدہ عورت تھی۔ خبر سن کر خوش تو ہوئی۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شاہد نے اپنی بات بتائی ہی نہیں کہ روپیہ کہاں سے آیا تو وہ کچھ متفکر سی ہو کر بولی

"خدا خیر کرے۔ اللہ سب کا محافظ ہے۔"

پھر معاً اسے خیال آیا کہ چھوٹوں کے سامنے اسے متفکر نہیں ہونا چاہئے اس لئے مسکراتے ہوئے بہو کو مخاطب کیا ——

"بیٹی مرد ہوتا ہی کماؤ ہے۔ جو ہاتھ ہر مہینہ سوا سو روپیہ کما سکتے ہیں وہی ہاتھ دس ہزار روپے بھی کما سکتے ہیں خدا میرے بیٹے کے بازوؤں کو نظر بد سے بچائے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔"

طلعت کا دیور جو کالج میں ایف اے کی جماعت میں پڑھتا تھا بولا "امی میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو السٹریٹڈ ویکلی کا معمہ صحیح حل کرنے پر انعام ملا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا نادہ انگریزی تصویروں والا رسالہ جو بھائی جان ہر ہفتہ لاتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ اسی رسالہ کے معمہ کا ایک انعام ۲۴ ہزار روپے مدراس کے ایک غریب اسکول ماسٹر کو ملا تھا۔ ممکن ہے اس ہفتہ کا انعام بھائی جان کو ملا ہو۔"

طلعت کی نند نے جو کی طلعت سے ہمیشہ جلتی رہتی تھی طلعت کو چھیڑنے کے لئے اپنے کماؤ بھائی کی تعریف کرتے ہوئے اترا کر بولی "میرے بھائی جان کا ہاتھ پارس پتھر ہے جس کو چھولے گا اسے سونا بنا دیگا"

طلعت اپنی نند کی اس دلیل سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی البتہ وہ اپنے دیور کی بات پر ساٹھ ستر فی صد یقین لے آئی کہ ممکن ہے شاہد کو معمے کا انعام ملا ہو آخر ہر روز وہ ان معموں پر کتنا سر کھپاتا ہے رات کے دو بجے تک۔ بس وہ

پیں ادا کیے۔ رات کے کوئی نو سوا نو بجے شاہد گھر لوٹ آیا بہت خوش تھا
دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنی ماں سے کہا۔
"امی ــ آپ ہمیشہ اس مکان کو کوسا کرتی تھیں کہ مکان ہے یا جیل ــ
لیجئے کل سے ہم ایک شاندار فلیٹ میں رہیں گے بہتر بن۔ ہوا دار کمرے
صاف ستھرے پختہ، بجلی، پانی کا نل، غسل خانے میں شاور، سنڈاس فلیش ایک دم
جیسے کسی رئیس کا گھر ہو ــ اب ہمارے دن پھر گئے چار سال جس طرح
اس جیل میں رہے ہیں اس کو اب یاد کرتا ہوں تو جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے
ہیں" ماں نے پوچھا "لیکن بیٹا خدا نے ہم غریبوں پر یہ مہربانی کس طرح کی؟"
شاہد نے طلعت کی طرف دیکھا اور طلعت نے مسکرا کر آنکھ مار دی
کہ جیسے کہہ رہی ہو اب بولو کہاں بچ کر جاؤ گے؟ ــ اب تو بتانا ہی پڑے گا
طلعت کی مسکراتی نظروں کی زد میں شاہد کے ہونٹوں پر ایک شکست خوردہ
مسکراہٹ آگئی ــ اس نے کہا امی ــ آپ کو یاد ہو گا اب سے آٹھ
سال پہلے جب ہم دہلی میں تھے میں نے اپنا بیمہ کروایا تھا اور ابا جان کے
بیمہ کی رقم بھی اس بیمہ کمپنی میں تھی۔ وہ بیمہ کمپنی اب فیل ہو گئی ہے۔ اس لئے
اس نے اپنے کلائنٹس CLIENTS کے روپے واپس کر دئے ہیں میرے اور ابا جان کے

روپے ملا کر وہ دس ہزار بنتے تھے وہ اچانک وصول ہو گئے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں تھا۔ دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ مجھے ایک چک ملا۔ وہ کہاوت ہے نا خدا جب کسی کو نوازتا ہے تو اس سے صلاح مشورہ نہیں کرتا ——!"

ماں بہن اور بیوی عام معمولی پڑھی لکھی پاکستانی عورتیں جو اپنے مردوں کی ہر بات پر ایمان لے آتی ہیں۔ ان کے لئے شاہد کا یہ جواب بالکلیہ قابل قبول تھا۔ اس جواب سے طلعت بھی مطمئن ہو گئی تھی اور غالباً شاہد بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اس لئے رات کو نہ طلعت نے شاہد سے اس بارے میں کچھ پوچھا اور نہ شاہد نے مزید کچھ بتایا البتہ وہ دونوں رات گئے تک نئے مکان کے سجانے سنوارنے کے لئے فرنیچر اور دیگر ضروری سامان خریدنے کے لئے فہرستیں بناتے رہے۔ البتہ جب وہ بستر پر لیٹے تو طلعت نے کہا۔

شاہد —— مجھے فلیٹ میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ یوں بھی فلیٹ کا ہر مہینہ کا کرایہ دینے کی مصیبت ہے ہم انہیں روپوں میں ایک ذاتی مکان بنا سکتے ہیں جیسا کہ میری سہیلی نجمہ کے شوہر نے بتایا ہے۔ چار ہزار روپئے میں کتنا اچھا مکان بنایا ہے ان لوگوں نے —— ہم دو تین مہینے اور اسی جیل میں گذر بسر کر لیتے ہیں۔ اب بھی موقع ہے تم اس دلال سے کہدو کہ وہ فلیٹ کسی اور کو دیدے"

شاہد نے کہا

"طالی تمہیں پتہ نہیں کہ اماں اور میں خود اس جیل سے کتنا تنگ آگیا ہوں۔ اس مکان کی گھٹن کی وجہ سے ہر روز کوئی نہ کوئی بیمار ہوتا ہے۔ سارے ڈاکٹر خون نچوڑ لیتے ہیں اور بھی جب ہمیں دس ہزار روپئے ایک بار مل سکتے ہیں تو اللہ اور بھی دے گا تین چار مہینے تو بیشک ہم یہاں گذار سکتے ہیں۔ لیکن کیا کردں مجھے سرکاری کام سے کل شام یا پرسوں صبح ضرور لاہور چلے جانا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے تم لوگوں کو اس جیل سے آزاد کرا دوں۔"

اس کے بعد شاہد نے کچھ دیر طلعت سے باتیں کیں اور سو گیا۔ طلعت بھی سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ نظروں کے آگے نیا فلیٹ کھڑا تھا جس میں وہ بڑی بیگم بنی اس کمرے سے اس کمرے میں پھر رہی تھی نوکروں پر حکم چلا رہی تھی۔ یہ تصور بڑا سہانا تھا لیکن بچے کے رونے کی آواز سے یہ سہانا تصور ٹوٹ گیا اور اس نے اپنے اپ کو پھر پرانے مکان میں پایا تو اسے معاً اس پرانے مکان سے نفرت ہو گئی حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ ابھی تین چار مہینے اس مکان میں رہ سکتی ہے لیکن اس تصور کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے تین چار مہینے تو کجا وہ کل کا دن بھی اس مکان میں نہیں

رہ سکتی۔ سچ مچ وہ ایک نیم اندھیرے دوزخ میں جہاں ہوا اور روشنی کا کوئی گذر نہیں۔ جہاں بیماری کے سوا اور کوئی نہیں آتا تھا۔ آج ساس بیمار ہے تو کل نند، پرسوں دیور، ترسوں اسکا اپنا ننھا بچہ اور اکثر اوقات وہ خود ـــــ اس مکان کی تنگی اور گھٹن نے رہنے والوں کے دل میں بھی جیسے تنگی اور گھٹن پیدا کر دی تھی۔ سب کے مزاج چڑ چڑے سے تھے۔ سب سے زیادہ بد مزاج تو خود طلعت ہو گئی تھی۔

ـــــ لمبے دے کے دو کمروں والا مکان۔ ایک میں کھانا پکانا، نہانا سب کچھ۔ دوسرے میں سامان اور بستر ہی بستر، اس مکان میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ اس سے کتنے کتنے مہینے اجنبی سی رہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی منگیتر ہے۔ جیسے اس کی شادی نہیں۔ یا ابھی، شادی، ہونے والی ہے۔

باہر کوئی شوہر کا ملنے والا آگیا تو اور آفت ـــــ سب مرغیوں کی طرح باورچی خانے میں بند ہیں۔ طلعت کا ساس اور نند سے اکثر جھگڑا بھی اسی وجہ سے ہوتا تھا کہ انکی موجودگی کے باوجود بیوہ تھی۔ اور گھر کی مالکن ہونے کے باوجود نوکرانی ـــ یہ سوچتے سوچتے وہ سو گئی ـــ لیکن نیند کی دنیا

میں بھی اسے وہی آن دیکھا فلیٹ نظر آیا۔ جس کو وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے، دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا شاہد جس کی مضبوط ہاتھ ہر مہینہ سوا سو روپے کماتے ہیں۔ اور آج جن ہاتھوں نے ایک دم دس ہزار روپے کمائے ہیں اپنے انہیں مضبوط ہاتھوں پر طلعت کو اٹھائے ہوئے اس فلیٹ میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ فلیٹ جیسے کسی امیر آدمی کا محل معلوم ہو رہا تھا۔ جمیں آرام دہ فرنیچر جگہ جگہ بچھا ہوا ہے۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے لہرا رہے ہیں، اور پھر ایک رومانی سی خوابگاہ میں شاہد نے طلعت کو ایک نرم لچکیلے اور مخملیں پلنگ پر گرا دیا ہے، اور پلنگ جھول رہا ہے۔ طلعت بھی جھولی جا رہی ہے۔ ایک میٹھی میٹھی تھکن سے کراہ رہی ہے پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی ہے۔ اور جھولے جا رہی ہے۔

صبح سویرے شاہد ایک ٹیکسی کار لے آیا اور طلعت، بچہ، ماں، بہن اور بھائی کو سوار کر وا کے نئے فلیٹ میں لے آیا۔ نیا فلیٹ گویا سب کی ہونٹوں کی مسکراہٹ بنا ہوا تھا۔ پختہ پلاسٹر کی دیواروں والے چار کمرے جس مین بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے علیحدہ باورچی خانہ، غسل خانہ، پاخانہ سڑک کی طرف کھلنے والے کمرے کے سامنے پُر رونق بازار جہاں ڈاکٹر کی ڈسپنسری، ایک کنڈرگارٹن سکول، لانڈری، ہیر کٹنگ سیلون

قصائی کی دکان دودھ کی دکان، جنرل مرچنٹ کی شاپ، درزی غرضیکہ
ضرورت کی ہر چیز پانچ منٹ میں دستیاب ہوسکتی تھی۔

صبح کا ناشتہ نئے فلیٹ میں کرنے کے بعد شاہد طلعت سے اور روپیہ
لے کر بازار چلا گیا اور تیسرے پہر لوٹا تو اس کے ساتھ دو وادنٹ گاڑیاں تھیں
جس میں صوفہ سیٹ، کھانے کی میز، لکھنے کی میز، کرسیاں، فرش پر بچھانے والے
ٹاٹ الم غلم اور بالخصوص وہی اسپرنگ کا نرم لچکیلا اور مخملیں پلنگ جو اس
نے کل رات خواب میں دیکھا تھا۔ اس پلنگ کو دیکھ کر طلعت کو بڑی شرم آئی۔

رات طلعت کو شادی کی پہلی رات محسوس ہوئی، اسے پہلی بار محسوس ہوا
کہ وہ شاہد کی بیوی —— بلکہ جائز بیوی ہے۔ اور پھر وہ اسپرنگ کا پلنگ
—! بہت دیر بعد جب طلعت سونے لگی تو شاہد نے یہ کہکر اس کی نیند
اڑادی کہ وہ کل صبح کی گاڑی سے لاہور جا رہا ہے۔ طلعت نے اس سے پانچ
چھ روز اور رکنے کی التجا کی۔ اور صاف صاف بغیر کسی شرم کے اس سے کہدیا
کہ دیکھو تو میں کتنے عرصہ بعد دلہن بنی ہوں، تمہاری بیوی بنی ہوں لیکن کام
اور وہ بھی سرکاری کام ——!

شاہد دوسری صبح لاہور چلا گیا۔

شاہد کی عدم موجودگی طلعت کو ایک بار پھر بیوہ بنا گئی وہ اسلئے اور بھی زیادہ پریشان تھی کہ شاہد کو گئے ہوئے آٹھ روز کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ حالانکہ شاہد نے لاہور پہنچتے ہی دوسرے دن خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور یوں بھی جب کبھی وہ دوسرے شہر جاتا تو ہر روز اپنی طالی کو ایک محبت نامہ ضرور پوسٹ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنا لاہور کا پتہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ خود اس کو خط لکھتی۔

پندرہ دن گذر گئے۔ بیس دن گذر گئے۔ اکیسویں دن صبح صبح طلعت غسل خانے میں منہ دھو رہی تھی کہ اس کا دیور پریشانی کے عالم میں باہر سے دوڑا دوڑا آیا اور گھبراہٹ میں پکارنے لگا۔

بھابی — امی — غضب ہوگیا غضب۔"

حامد کے ہاتھوں میں ایک اخبار تھا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور اخبار میں ایک خبر تھی کہ پولیس نے کمرشیل بنک کے ایک کلرک شاہد حسین کو دس ہزار روپے غبن کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے

ایک مہینہ بعد طلعت کو اطلاع ملی کہ شاہد کو لاہور سے کراچی جیل لایا گیا ہے

اور آج عدالت سے اسے سزا سنائی جائے گی۔ طلعت اور گھر کے سارے افراد روتے دھوتے عدالت پہنچے شاہد نے اس دوران میں اتنی رازداری برتی تھی کہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے کیسا ہے۔ ضمانت پر رہا ہونے کی کوشش کیوں نہیں کی کوئی وکیل کیوں کھڑا نہیں کیا۔ صرف اس دن انہیں اطلاع بھجوائی جس دن سے سزا ہونے والی تھی۔

عدالت نے شاہد کو سزا سنادی۔

اس کے بعد جس وقت شاہد کو قیدیوں کی لاری میں سوار کرایا جارہا تھا اس وقت طلعت شاہد کی ماں بہن اور بھائی نے اسے گھیر لیا۔ سنتری کوئی رحم دل آدمی تھا دو منٹ بات کرنے کی اجازت دیدی۔ شاہد کے چہرے پر اس وقت بھی اطمینان کی چھاؤں تھی۔ وہ اپنی محبتوں کو دیکھ کر بڑی لاپروائی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر بے تحاشہ چومنا شروع کر دیا

طلعت نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "شاہد تم نے یہ کیوں کیا بولو شاہد۔ اس فلیٹ سے تو یہی بہتر تھا کہ ہم اسی جیل میں رہتے ۔۔۔ !"

شاہد نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "رو رہی ہو پگلی ۔۔۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے دراصل یہ سوچا تھا کہ آٹھ آدمیوں کے جیل

میں رہنے کہیں بہتر ہے کہ ایک آدمی جیل میں رہے۔ اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو ۔۔۔
اچھا اماں، بی بی، حامد تم سب طلعت اور بچہ کا خیال رکھنا۔ باقی روپیہ بینک میں
نہیں جمع کرنا۔ اپنے پاس ہی رکھ کر خرچ کرتے رہنا۔ مگر بڑی کفایت شعاری سے خرچ
کرنا تاکہ جب تک میں باہر نہ آؤں تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔
یہ کہکر اس نے بچے کو طلعت کی آغوش میں دیدیا۔ مسکرانے کی کوشش کی لیکن
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ پھیر کر سنتری کے ساتھ
آگے بڑھ گیا۔ پھر جیل کی لاری نے شاہد کو طلعت کی بڑی بڑی آنکھ سے اوجھل کر دیا
نئے فلیٹ میں پہنچ کر طلعت نے اپنے اسپرنگ کے لچکدار مخملیں پلنگ پر گر پڑی لیکن
اس کے جسم میں کوئی جان نہ تھی اور نہ اس پلنگ میں کوئی لچک ۔۔۔ وہ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے
چہرے کو تکئے پر رکھ کر سوچنے لگی کہ کون گرفتار ہوا ہے۔ اور کون آزاد ہوا ہے؟
اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسے یوں نظر آیا جیسے اس کھڑکی میں آنسوؤں
کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔
طلعت کو تین سال قید با مشقت کی سزا ملی تھی۔

سپاہی

پالم کے ہوائی اڈے سے اڑتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب ہوائی جہاز
میں جان پڑی ہے، اور خشک اور بے مزہ سفر رنگین ہو گیا ہے
وہ جان ایک جوان سال برمی عورت تھی۔ ستائیس اٹھائیس سال کی ایک
بھرپور عورت۔ جس کے رخساروں کی پیلی جلد جوانی اور سرخ لہو کے باعث پیلی
نہ رہی تھی، اور ارغوانی ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر سفید چکن کا کرتہ ایسا پھنسا پھنسا
تھا کہ اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط بے حد نمایاں ہو گئے تھے اور اس کا زیریں
جسم پیار کیٹ کی پھولدار سبز لنگی میں لپٹا ہوا تھا، اور اس کے پیروں میں سرخ رنگ
کی کھڑاویں تھیں۔ وہ عورت بہت زیادہ خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اتنی بھی خوبصورت
نہیں جتنی کہ فرانسیسی ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں کی مثالی ہیروئن ہوتی ہے،

یا پھر اردو شاعروں کی محبوبہ۔ البتہ اسکی بڑی بڑی سیاہ اور گہری آنکھوں میں
ایسی اداسی جو مجھے بار بار۔ وزدیدہ نظروں سے اس کو دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی
مجھے کہانیاں پڑھنے اور سننے کا بڑا شوق ہے۔ اور ایسی آنکھیں جن میں
اداسی بسی ہو وہ بلاشبہ دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عورت
بھی ایک کہانی ہے یا کسی ان کہی کہانی کی ہیروئن ہے۔ مجھے بے چینی سی محسوس
ہونے لگی۔ کیونکہ میرے سامنے صرف کہانی کی ہیروئن تھی۔ کہانی کے
دوسرے کردار نہیں تھے۔ خود وہ کہانی نہیں تھی جو اداسی بن کر اس بری عورت
کی بڑی بڑی چمکدار سیاہ آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ مجھے صرف کہانی کا اتنا ہی
ٹکڑا ملا تھا کہ ــ ایک عورت جوان اور خوبرو ایک لمبے سفر پر تنہا ہی جا رہی ہے
اور اس کی آنکھوں میں گہری اداسی ہے" یہ اداسی کون اس کی آنکھوں میں جھونک گیا
ہے۔ اور اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں معلوم ہو تا تھا۔
میں اس ہیروئن سے متعارف ہونے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اگر وہ مرد
ہوتی یا پھر کوئی انگریز، امریکی یا یورپی عورت ہوتی تو کوئی دقت کی بات نہیں تھی
لیکن وہ ایک ایشیائی عورت تھی۔ اور اداس اور بالکل گم سم تھی حتی کہ ہوائی جہاز کی
ہوسٹس سے بھی مسکرا کر بات نہ کرتی تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی اور نہ گود میں پڑی

ہوئی کتاب پڑھتی۔ صرف کھڑکی سے باہر اڑتے ہوئے ابر پاروں اور نیلگوں آسمان
کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے متعارف ہونے کی بےشمار ترکیبیں سوچیں۔ لیکن
ایک ترکیب کو بھی ۔۔ روبہ عمل لانے کی ہمت نہ پڑی ۔۔۔ میں بڑا بےچین ہو گیا تھا
کیونکہ اگر میرا اس عورت سے تعارف نہ ہو سکا اور میں اس کی کہانی نہ سن سکا تو پھر
وہ عورت۔ مجھے زندگی بھر تنگ کرتی رہیگی جب مجھے کہیں کوئی اداس آنکھوں والی،
عورت نظر آئیگی یہ بری عورت بھی میرے سامنے آجائیگی اور مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر
پوچھے گی ۔۔ "بتاؤ میری آنکھیں اداس کیوں ہیں؟ ۔۔۔ کیا تم میری زندگی کی
اداسی کی کہانی نہیں جانتے؟"

کلکتہ کے ڈم ڈم ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز اترا۔ میں نے سوچا اب میں ضرور
ہمت سے کام لونگا ۔۔۔ چاہے اس کا کتنا ہی برا نتیجہ کیوں نہ نکلے! ۔۔۔ جب
سارے مسافر ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے میں اس کے بالکل ساتھ
ہو گیا۔ اور جب آخری سیڑھی باقی رہ گئی تو میں جان بوجھ کر پھسل پڑا جس کی وجہ
سے میں اس عورت سے ٹکرا گیا اور اس کے ہاتھ سے اس کا ہینڈ بیگ اور کتاب
نیچے گر پڑی۔ میں نے فوراً سنبھل کر اس کا ہینڈ بیگ اور کتاب اٹھا لی اور بڑے
معذرت کے لہجے میں بولا ۔۔۔

"آئی ام سو ساری مادم ــــ میرا جوتا دراصل بالکل نیا ہے میں نے کل ہی خریدا تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

اس نے چپ چاپ ہینڈ بیگ اور کتاب مجھ سے لے لی۔ میری معذرت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس کے چہرے اور آنکھوں میں میری بدتمیزی کے باعث غصّے کی کوئی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں آئی تھی۔ البتہ اسوقت اسکی آنکھوں کی اداسی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

ڈم ڈم کے ریفرشمنٹ روم میں چند میزوں پر کارڈ لگائے گئے تھے "اسپیشل ریزروڈ فار بی اے اوسی پسنجرس۔"

سارے مسافر مل جل کر مختلف میزوں پر جا بیٹھے۔ لیکن وہ برمی عورت سب سے الگ ایک میز پر بیٹھ گئی جس کے اطراف تین کرسیاں خالی تھیں میرے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا کہ میں اس میز پر بیٹھوں کیونکہ وہ میز بھی بی او اے سی کے مسافروں کے لئے ریزرو تھی۔ میں اس میز پر بیٹھ گیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

"مادام مجھے بڑا افسوس ہے کہ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ....

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ

"نہیں نہیں ــــ کوئی بات نہیں ــ وہ تو اتفاقاً ہوا ہے۔ آپ نے عمداً تو ایسا نہیں کیا تھا ــــ !"

میں بڑا خوش ہوا کہ اسے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ میں نے عمداً ایسا کیا تھا۔ اور خوشی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے بات تو کی۔ میں اس بہترین موقع سے جلدی جلدی اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا کہ عرصے کے بعد کھلی ہوئی زبان پھر بند نہ ہو جائے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں ؟"

اس نے بڑا ہی مختصر سا جواب دیا

"رنگون ــــ !"

میں دراصل جاپان جا رہا تھا۔ لیکن رنگون میں مجھے سات آٹھ دن ٹھہرنا تھا اس لئے میں نے جھوٹ کہہ دیا

اچھا ــــ میں بھی رنگون جا رہا ہوں ــ اور پہلی بار جا رہا ہوں۔ رنگون کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن اب کوئی پروا نہیں۔ آپ شاید رنگون کی رہنے والی ہیں۔ آپ ایک اجنبی مسافر کی رنگون میں یقیناً مدد کریں گی !"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ ایشیائی باشندے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ وہ اجنبی مسافروں سے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ پردیسیوں کے لئے سب کچھ لٹا دینا ہی تو ایشیائی باشندوں اور قوموں کی پرانی تاریخ ہے میں اس سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اٹھی اور سامنے ٹائیلٹ روم میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے چائے کی پیالی بھی ادھوری چھوڑ دی تھی — میں حیرانی سے سوچتا رہ گیا عجب عورت ہے — عجب ہیروئن ہے۔ کہانی کو پیچھے دھکیل کر ہر بار آگے آجاتی ہے۔ منہ سے بات ہی نہیں کرتی — صرف آنکھوں کی اداسی کیا باتیں کر سکتی ہے کیا سمجھا سکتی ہے !!!

تھوڑی دیر بعد ہوائی جہاز کلکتہ کے ہوائی اڈے سے اڑا اور اڑتا رہا۔ اور وہ پراسرار برمی عورت پہلے کی طرح چپ چاپ گم سم کھڑکی سے باہر اڑتے ہوئے ابر پاروں اور نیلگوں آسمان کی پہنائیوں کو دیکھتی رہی۔ ہوائی جہاز میں صرف اس کا ساکت و صامت جسم گدیلی سیٹ پر نیم دراز تھا لیکن وہ خود کہیں اور بھٹک رہی تھی۔

سرِ شام بڑی زوروں کی بارش ہونے لگی اور اسی دھواں دھار بارش میں ہوائی جہاز منگلاڈون کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ سارے مسافر ہوائی اڈے کی عمارت میں جمع ہو گئے — میں نے وہاں دیکھا کہ اس اکیلی برمی عورت کو لینے کے لئے۔

ایک موٹی بری بڑھیا اور ایک چھ سات سالہ لڑکا کھڑے تھے۔ بری عورت لڑکے کو دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اسے اپنی چھاتی سے لپٹا کر اور باہوں سے بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پراسرار کہانی کا دوسرا کردار میرے سامنے آگیا تھا میں اس دوسرے کردار کو پہچان گیا۔ وہ ننھا کردار اس عورت کا بیٹا تھا — بیٹا ہی ہوسکتا تھا ورنہ اسکو اپنی آغوش میں ایسی مضبوطی سے بھینچ کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روتی۔ اب کہانی کافی حد تک آگے بڑھ آئی تھی — لیکن صرف ایک اہم کردار اوجھل تھا اور وہ کردار اس عورت کا شوہر یا اس کے بچے کا باپ تھا۔ وہ کہاں ہے — وہ اپنی بیوی کے استقبال کے لئے ہوائی اڈے پر کیوں نہیں آیا —؟ کیا وہ مر گیا —؟ کیا وہ اسے ویران کر کے بہت دور چلا گیا ہے؟ دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو وہ مر چکا ہے — یا پھر اس کی آغوش کو اجاڑ کر چلا گیا ہے۔ ورنہ عورت کبھی اتنا پھوٹ پھوٹ کر نہیں روتی۔ اس کی یادگار یعنی اپنے بچے کو اس بری طرح اپنی باہوں میں نہ جکڑتی اسقدر نہ بھینچتی! اب شاید اس کا شوہر صرف اداسی بنکر اس کی آنکھوں میں رہتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد عورت کے انسوؤں اور بارش کا زور ٹوٹ گیا صرف بوندا باندی رہ گئی۔ آنکھیں صرف نم ناک تھیں۔ بی او اے سی کی پسنجر بس سارے مسافروں کو رنگون شہر کی طرف لے گئی جو ہوائی اڈے سے ڈھائی میل دور واقع ہے۔ اسٹرینڈ ہوٹل پہنچتے پہنچتے بارش پھر تیز ہو گئی۔ سارے مسافر بس سے اتر کر لابی میں بیٹھے چائے اور شراب پینے لگے۔ صرف وہ برمی عورت اس کا بچہ اور اس کے ساتھ والی بڑھیا خاموش ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے میں اسی میز کے بالکل قریب بیٹھ گیا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں اور یہ کہانی کچھ اور آگے بڑھے۔ وہ تینوں برمی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ برمی زبان میں بڑی حد تک سمجھ لیتا ہوں۔ صرف بول نہیں سکتا۔ بوڑھی برمی عورت کہہ رہی تھی۔۔ بارش تھم جائے تو پھر ٹیکسی منگواتی ہوں۔"

نوجوان برمی عورت کہہ رہی تھی ـــــ

"نہیں بارش اتنی تیز نہیں تم ٹیکسی منگوا لو میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں ـــ میں جب لندن سے اڑی تھی تو مجھے اسی وقت بخار تھا جو قاہرہ پہنچتے پہنچتے بہت تیز ہو گیا ـــ منگوا لو ٹیکسی ـــ"

بوڑھی عورت اٹھی اور ہوٹل انٹرنس کی طرف چلی گئی۔ کہانی تھوڑی سی

آگے بڑھی ضرور لیکن اور زیادہ پر اسرار ہو گئی تھی — وہ عورت لندن کیوں گئی تھی۔ کیا اس کا شوہر لندن میں رہتا ہے —؟ یہ عورت اتنی اداس کیوں ہے؟

میں نے سوچا اگر ٹیکسی آگئی اور یہ عورت چلی گئی تو پھر کہانی ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ جائے گی۔ کیا کرنا چاہئے —؟ کچھ تو کرنا چاہئے۔ میں اٹھا اور ہوٹل کے منیجر کے پاس چلا گیا۔ اس سے بولا —

" ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ مجھے میرے کمرے کا نمبر بتا دو اور میرا سامان اس میں رکھوا دو —.

منیجر نے میرے کمرے کا نمبر بتا دیا اور بیرے سے کہا کہ صاحب کا سامان کمرے میں رکھ دو اور پھر اس نے دوسرے بیرے سے ٹیکسی منگوا دی۔ اس وقت پورٹیکو میں دو ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ اگلی ٹیکسی میں نوجوان بری عورت اس کا لڑکا اور بوڑھی عورت بیٹھ گئے۔ اور پچھلی ٹیکسی میں میں بیٹھ گیا۔ اور ڈرائیور سے بولا — " تم اس اگلی ٹیکسی کے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔"

پندرہ بیس منٹ بعد اگلی ٹیکسی ایک گلی میں ایک مکان کے آگے رکی میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اپنی ٹیکسی ذرا سا آگے لے جا کر روک لے پھر میں نے ڈرائیور سے پوچھا " اس گلی کا کیا نام ہے؟"

اس نے بتایا، "فارٹی ٹو اسٹریٹ۔"

اس مکان کا نمبر ۲۳ تھا ۔۔۔ ان کہی کہانی کی ہیروئن کا پتہ تھا۔
۔۔۔ ۲۳ فارٹی ٹو اسٹریٹ رنگون ۔۔۔ بارش تھم چکی تھی ۔۔۔ پراسرار ہیروئن
اپنے گھر میں داخل ہو چکی تھی ۔۔۔ اور گھر کا دروازہ بند ہو چکا تھا، میں نے ٹیکسی
ڈرائیور سے کہا، "واپس ہوٹل چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"آپ پھر اس سے ملے کیوں نہیں ۔۔۔؟ اس نے آپ کی طرف دیکھا۔
کیوں نہیں ۔۔۔ یہ بات کیا ہے ۔۔۔؟"

میں اب ٹیکسی ڈرائیور کو کیا سمجھاتا کہ میں صرف ایک عجیب غریب کہانی
کے نقطۂ عروج تک پہنچنا چاہتا ہوں ۔۔ اب میں اس سے ملا کیوں نہیں
۔۔۔؟ تو ظاہر ہے کہ میں اس کہانی کا کوئی کردار نہیں کہ اس سے ملتا ۔۔۔ اور
اس نے میری طرف دیکھا کیوں نہیں؟ ۔۔۔ کا جواب بھی یہی ہے کہ میں اس
کہانی کا ہیرو نہیں ہوں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا ۔۔۔

"بس اب تم مجھے ہوٹل واپس لے چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پھر مسکراتا ہوا بولا ۔۔۔ "اچھا میں سمجھا

صاحب گرل مانگتا ہے، گرل ـــ"

مینی نے اس سے کہا

"نہیں یار ـــ گرل ورل نہیں مانگتا ـــ اچھا تم یہ بتاؤ کہ برمی ہو کر یہ اردو کس طرح بول لیتے ہو؟"

ڈرائیور نے کہا

"عشق خانہ خراب ہوتا ہے صاحب! ـــ دس سال پہلا ادھر ہمارے پڑوس میں بمبئی کا لوگ رہتا تھا ـــ اس گھر میں ایک گرل تھا ـــ ایک دم فسٹ کلاس۔ ہمارا اس کا لوف ہو گیا۔ اور جب وہ لوگ بمبئی چلا گیا تو ہم بھی بمبئی گیا۔ دس سال ادھر بمبئی میں ٹیکسی چلایا۔ اور ابھی لاسٹ ایر اپنا گرل کو وائف بنا کے رنگون لایا ہے۔ مگر صاحب آپنے بتایا نہیں۔ آپ اس گرل کا پیچھا کیا اور یونہی خالی پیلی واپس ہو گیا ـــ!!"

میں نے دل میں کہا کم بخت میں نے اسی سوال کا جواب نہ دینے کے لئے اور تیری توجہ ہٹانے کے لئے تو یہ غیر ضروری سوال پوچھا تھا کہ تم اردو میں کس طرح بول لیتے ہو! لیکن تم بھی بڑے فرد ہو۔ میں نے اسے پھر ٹالنے کے لئے کہا ـــ

"نہیں بھئی —— وہ عورت ہمارے ساتھ ہوائی جہاز میں تھی —— مجھے اس کا پتہ چلانا تھا۔ اس لئے میں اس کا گھر دیکھ لینا چاہتا تھا۔"

ٹیکسی ڈرائیور بڑا رنگیلا آدمی تھا بولا

"صاحب ہم سمجھ گیا۔ آپ کو اس سے لوف ہو گیا ہے۔ مگر اس سے بھی بڑا بیوٹی فل عورت ادھر رہتا ہے صاحب ——"

میں نے کہا

"نہیں تم صرف ایک کام کرو۔ تم یہ پتہ کر کے بتاؤ کہ یہ عورت، کون ہے۔ کیا کرتی ہے۔ ایسی غمگین کیوں رہتی ہے۔ بس۔ ہم تم کو خوب انعام دے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا ——

"اچھا صاحب —— ہم کل شام تک تم کو ضرور پتہ کر دے گا۔ ہم اسٹرینڈ ہوٹل کے سامنے ہمیشہ کھڑا رہتا ہے۔ ہمارا ٹیکسی نمبر ہے ۷۹۵۱ —— تم کسی بیرا کو بولو —— وہ ہم کو بلا دے گا۔"

دوسرے دن میں رنگون کے بڑے بازار میں شاپنگ کے لئے گیا بڑی دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد بڑے پگوڈا کے قریب اچانک مجھے

پراسرار کہانی کی ہیروئن نظر آئی۔ اس کے ساتھ صرف اس کا چھ سات سالہ بچہ
تھا۔ اس نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ اور شاید پہچانا بھی ہو تو انجان بن گئی۔ وہ
جب ایک کیفے میں داخل ہوئی تو میں بھی اس کیفے میں داخل ہوا دوپہر کا وقت
تھا۔ کیفے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ بالکل اور محض اتفاق تھا کہ ایک ہی میز خالی
تھی ــــــ جس پر وہ اپنے لڑکے سمیت بیٹھ گئی۔ میں ہمت کر کے اس کی میز
کے قریب گیا اور بولا

"عجب اتفاق ہے کہ آپ سے دوسری بار ملاقات ہوئی ہے۔"

اس نے صرف ہاں کہا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا

"کیفے بہت بھرا ہوا ہے، بیٹھنے کے لئے کہیں کوئی میز خالی نہیں ہے
اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس میز پر اپنا لنچ کھا لوں؟"

"یہ تو کیفے کی میز ہے۔ میرے برا ماننے کا کیا سوال ہے؟"

میں ڈھیٹ بن کر بیٹھ گیا لیکن اس کے بے رخی کے باعث میں
اس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ خاموش رہا۔ البتہ میں نے اتنا کہا

"میز پر اکٹھے بیٹھنے کے بعد لنچ کے لئے الگ الگ آرڈر دینا کچھ اچھا نہیں
معلوم ہوتا، اگر آپ میرا آرڈر بھی دے دیں تو مہربانی ہو گی ــــ میں اپنا بل

.... وہ خاموش رہی۔ لیکن جب بیرا آیا تو اس نے تینوں کے لئے لنچ کا آرڈر دے دیا۔ بیرے نے غالباً یہی سمجھا ہوگا کہ وہ میری بیوی یا میری دوست وغیرہ ہوگی۔ لنچ کے بعد وہ اپنے بچے کا ہاتھ منہ دھلانے کے لئے ٹائیلٹ کی طرف گئی اور اپنا بیگ میز پر چھوڑ گئی۔ میرے ذہن میں معاً ایک ترکیب آئی یعنی اس عورت سے اس کے گھر پر بھی ایک ملاقات کی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں نے فوراً بیرے کو بلایا۔ تینوں کا بل دے کر میں نے اس سے کہا۔

"میم صاحب ٹائیلٹ روم سے باہر آئیں تو کہنا صاحب باہر کار میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔"

یہ کہہ کر میں جلدی سے اٹھا اور اس کا ہینڈ بیگ لے کر کیفے سے باہر نکل گیا۔ اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل آ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے اس کا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس میں چند روپے اور تین خط تھے ایک خط میں نے کھول کر پڑھا جس پر ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کی تاریخ تھی وہ خط انگریزی فوج کے ایک لفٹیننٹ جوزف نکولس کا تھا۔ جو بہت مختصر تھا۔

"پیاری جی جی کن!

— مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ عیسیٰ مسیح کی مہربانی

سے تمہارے لڑکا پیدا ہوا ہے ۔۔۔ میں بھی چاہتا تھا کہ
لڑکا ہی پیدا ہو ۔ مجھے لڑکیاں پسند نہیں ۔۔ لیکن خیر ۔
تم اس "حادثے" کے باعث بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئی
ہو گی ۔ لیکن فکر نہ کرو میں عنقریب چھٹی لیکر رنگون آؤنگا
اور تمہیں سیدھا لندن لے جاؤنگا ۔ اور وہاں ہم شادی
کر لیں گے ۔۔ اصلی شادی تو ہو چکی ہے ۔ لیکن دنیا کے
دکھانے کے لئے ایک بار ڈھونگ تو رچالیں ۔۔
بچے کا کیا نام رکھا ہے ۔۔؟ اس کا برمی نام ہرگز نہ رکھنا
اس کا نام ہنری نکولس رکھنا ۔۔۔۔

اچھا پیاری بہت بہت پیار

تمہارا جوزف نکولس

پتہ :۔۔ نئی دہلی آرمی ہیڈ کوارٹرس ۔۔۔

خط کا کاغذ بہت بوسیدہ ہو گیا تھا اور جہاں سے مڑا ہوا تھا وہاں سے
کچھ کچھ پھٹ بھی گیا تھا ۔
دوسرا خط کسی اور لفٹیننٹ مارشل ڈگینڈر کا تھا وہ لندن سے آیا تھا

اس پر ۱۴ جولائی ۱۹۵۳ء کی تاریخ تھی۔ جس میں یہ لکھا ہوا تھا ——

ڈیر مس مامی کن!

رنگون میں تمہارے ساتھ چند دن خواب کی طرح
یاد آتے ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں نے لندن
میں جوزف نکولس کی بڑی تلاش کی —— ایک دن مجھے
اس کا پتہ ملا —— تمہارا خیال غلط نکلا کہ وہ کسی محاذ پر
مارا گیا —— وہ اب فوج سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے تمہارا
یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ کنوارا تھا۔ اس کے تو سات بچے
ہیں۔ میں نے سنیچر کے دن اس کے ساتھ لنچ بھی کھایا
ہے۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت اور خلیق عورت ہے
—— خوبصورت اور بیوقوف می می کن! مجھے تم سے بڑی
ہمدردی ہے —— تم سپاہی کو نہیں سمجھ سکتیں۔ سپاہی
جب تک اپنے وطن کی سرحد پر کھڑا ہوتا ہے، سپاہی رہتا
ہے۔ لیکن جب وہ ایک تاجر سپاہی بن کر دوسرے ملکوں
میں جاتا ہے تو پھر اس میں اور ایک درندے میں کوئی

فرق نہیں رہتا —— تم اس کا بیکار انتظار کر رہی ہو۔
سامراجی ملک کا سپاہی دوسرے ملک میں کبھی محبت چھوڑ
کر نہیں جاتا —— وہ صرف حاملہ عورتیں ناجائز بچے،
جنسی بیماریاں، لوٹ کر آنے کے جھوٹے وعدے یا پھر
اپنی لاش چھوڑ جاتا ہے۔

اگر تمہیں سچ مچ اس سے محبت ہے تو لندن
آؤ۔ اس کا پتہ نیچے لکھے دیتا ہوں۔ تمہارے ننھے اور
پیارے ہنری نکولس کے گالوں پر میری طرف سے
محبت بھرے بوسے لینا۔

لندن آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔

تمہارا دوست

لفٹیننٹ مارسلینڈ کینڈر

تیسرا خط شاید تھا اور جوزف نکولس کے نام تھا۔ شاید وہ پوسٹ کیا
جانے والا تھا۔ شاید اس میں لندن سے ناکام واپسی کا حزنیہ بھی تحریر ہو۔ میرا
جی بہت چاہا کہ میں اسے بھی کھول کر پڑھوں لیکن میرے سامنے می می گن کا

اُترا ہوا چہرہ آ گیا اور اس کی اداس آنکھیں گھورنے لگیں میں نے سوچا یہ بیگ اب واپس کر دینا چاہئے۔ اگرچہ میں نے اس ارادے سے کہ می می کن کے ساتھ میری ملاقات اس کے گھر پر ہو سکے اس کا ہینڈ بیگ چرا لیا تھا کہ واپسی کے بہانے اس کے گھر پر جاؤں۔ لیکن اب کہانی مکمل ہو چکی تھی اس لئے میں گھر جانے کے بجائے اس پولیس اسٹیشن گیا جو اس کیفے سے قریب تھا مجھے یقین تھا کہ می می کن نے اپنے ہینڈ بیگ کے کھوئے جانے کی رپورٹ قریب ترین اسٹیشن میں کرائی ہوگی! میرا یقین ٹھیک نکلا۔ پولیس انسپکٹر نے ہینڈ بیگ لے کر کھولا۔ اور اس کے اندر کی وہ ساری چیزیں دیکھیں جو می می کن پولیس میں لکھوا گئی تھی۔ روپے اور ساری چیزیں جوں کی توں تھیں پولیس انسپکٹر نے میرا بیان لیا میں نے بیان میں لکھوایا کہ میں نے بہت ساری شاپنگ کی تھی اور میری میز پر بہت سامان تھا غلطی سے اس سامان میں می می کن کا بیگ بھی آ گیا۔ جو میں ڈیڑھ گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن کے حوالے کر رہا ہوں" پولیس انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ اس نے میرا بیان اور پتہ نوٹ کرنے کے بعد مجھے ہوٹل جانے کی اجازت دے دی۔

جب میں ہوٹل کے پورٹیکو میں پہنچا تو ٹیکسی نمبر ۱۵۹۷ کا ڈرائیور مسکراتا ہوا

میری طرف بڑھا اور بولا —

"صاحب! تم کدھر گیا تھا۔ ہم ایک دم پتہ کر آیا ہے۔ وہ سالا عورت تو سارے محلے میں بدنام ہے۔ اس سے کوئی عورت بات نہیں کرتا — وہ پیشہ بھی کراتا ہے۔ لیکن صاحب کتنا عجب ہے۔ وہ ایک بن باپ کے بچے کا ماں ہے — تھو تھو تھو — تم بولتا ہے تو ہم دوسرا بندوبست کر سکتا ہے —!"

میں نے لفٹ کے پنجرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں مسٹر ۱۹۵۷! ہم کو کچھ نہیں مانگتا ہے۔"

لفٹ جب اوپر چڑھنے لگا تو میں نے سنا ۱۹۵۷ کہہ رہا تھا

"یہ صاحب کا بھیجہ بھی کریک ہے بس —!"

بیوقوف ٹیکسی ڈرائیور — تو کیا جانتا ہے۔ جب بھی کوئی کہانی ایسے بھیانک طور پر ختم ہوتی ہے تو کوئی سچ مچ پاگل ہو جاتا ہے۔

نورافشاں کوئی بہت زیادہ خوبصورت عورت تو نہیں تھی۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت عورتیں زمین کے حسن کو دوبالا کر رہی ہیں۔ لیکن نورافشاں کی آنکھیں سچ مچ نورافشاں تھیں۔ عجب سحر کار آنکھیں —— نیم خوابیدہ سی آنکھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کچھ نیند سے جاگ پڑی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی سہانا۔ رومانی خواب ٹوٹ کر ادھورا ہی اس کی آنکھوں میں باقی رہ گیا ہے۔ بڑی بڑی جادوگر آنکھیں جو کسی بھی نوجوان کی آنکھوں سے پہلی بار ٹکرائیں تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جائیں۔ اس کے گال سرخ ہو جائیں اور وہ تنہائی میں بیٹھ کر کچھ اور بہت کچھ سوچنا شروع کر دے اور پھر یہ سوچ پھیلتے پھیلتے شاید عشق یا شاید جنون کے افق کو چھو لے۔

بھرے بھرے گداز اور چست جسم والی بہت لمبی نور افشاں جس کے گردن تک کٹے ہوئے بال سرخ تھے اور آنکھیں نیلی ——— اس کی جلد سرخ، گلابوں کے بے شمار پتیوں سے گوندھ کر اس کے متناسب جسم پر منڈھی گئی تھی ہر وقت یوں نظر آتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی شفق کی سرخ جھیل سے نہا کر نکلی ہو پری چہرہ جسم، نور افشاں جو اپنی زندگی کی چوبیسویں بہار سے نکل کر پچیسویں بہار میں داخل ہو رہی تھی۔

نور افشاں کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو بڑی دیر تک میری پلکیں جھپک نہ سکیں۔ اگر انسانوں کا سماج ایسا ہوتا جہاں شفق، قوس، قزح، چاند اور وینس کے مجسمے کی طرح خوبصورت عورت کو دیکھنے پر بھی کوئی پابندی یا روک ٹوک نہ ہوتی تو میں صرف نور افشاں کو نگاہوں کی منزل بنا لیتا۔ اور زندگی کی آخری پلک جھپک نے تک میں اسے دیکھتا رہتا اور مجھے بڑی خوشی ہوتی کے میری زندگی کے لمحے بیکار نہیں اڑ رہے ہیں۔

پہلی بار میں نے نور افشاں کو آسٹر ہاؤس ہوٹل کے لان میں دیکھا جہاں ایک امیر دوست کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں ایک دعوت عشائیہ منعقد کی گئی تھی۔ نور افشاں میرے ایک گہرے دوست خالد کے ساتھ

خالد کے ساتھ چار کرسیوں والی ایک میز پر بیٹھی تھی۔ اتفاق سے میرے نام کی کرسی بھی اسی میز کے ساتھ لگی ہوتی تھی۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میرے دوست خالد نے رسماً نورافشاں سے میرا تعارف کرایا

"اعظم ان سے ملو"

"مس نورافشاں ایم اے میجر جنرل سکندر شاہ کی صاحبزادی۔ اور یہ اعظم، ہمارے ملک کے مشہور افسانہ نگار۔"

میں نے نورافشاں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا مس نورافشاں!"

اس کے ساتھ ہی ساتھ میرا دل بھی کہہ رہا تھا کہ مس نورافشاں! یہ صرف رسمی جملہ نہیں بلکہ سچ مچ میں آپ سے ملکر بہت خوش ہوا۔ اور میں خالد کا بیحد ممنون ہوں کہ اس نے آپ سے میرا تعارف کرادیا ورنہ زندگی۔ ۔ ۔ ۔

مس نورافشاں نے مسکراتے ہوئے میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں جواب دیا ــــ رسماً

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

اس ایک لمحہ کے عرصے میں جب ہم دونوں کی آنکھیں اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہیں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے جنگل کے کسی برسوں سے ویران مندر میں کسی نے اچانک زور زور سے گھنٹیاں بجانی شروع کردی ہوں۔ اس کا نرم نازک ہاتھ جیسے اس مندر میں کوئی شمع جلا گیا ہو اور برسوں کا اندھیرا دور ہوگیا ہو۔ اس کے مخملیں ہاتھ کا نرم گرم لمس جس میں ایک بے حد لذیذ جسم کی ساری حلاوت سمٹ آئی تھی۔

کھانے کے دوران میں نور افشاں سے میری بڑی باتیں ہوئیں۔ ادب سیاست تاریخ اور فلسفہ کے موضوعات پر ــــ اور میری خوشی بڑھتی ہی چلی گئی کہ نور افشاں نہ صرف ایک دلآویز شخصیت بلکہ ایک بڑے خوبصورت ذہن کی عورت ہے۔ دعوت ختم ہو چکی تھی لیکن باتیں ادھوری رہ گئی تھیں اس لئے نور افشاں نے مجھے پھر ملنے کی دعوت دی اور ایک بار اور میرے ہاتھ میں ایک لذیذ سا لمس تھما کر چلی گئی

اس کے بعد نور افشاں چلی گئی لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نور افشاں کہیں نہیں گئی ہے۔ بلکہ میرے سامنے ہے اور اب اسٹر ہاؤس کے لان سے گذر کر میرے دل کے قریب آگئی ہے۔

نورافشاں سے ملنے سے پہلے میرا دل ایک نوتعمیر شدہ مکان کی طرح تھا جس میں ابھی کوئی آباد نہیں ہوا تھا اور جس پر کوئی ایسی تختی آویزاں ہو۔ مکان برائے فروخت۔ نورافشاں کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ مکان فروخت ہو چکا ہے اور نورافشاں نے اس مکان میں اجالے کی پہلی شمع جلائی ہے۔ جب میرا دل زور سے دھڑکنے لگتا۔ ٹک ٹک۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے نورافشاں اونچی ایڑی کی نئی گرگابی پہنے میرے خانۂ دل میں ٹہل رہی ہے۔

رات کو میں نے سونے کی بڑی کوشش کی لیکن نورافشاں نے سونے ہی نہ دیا۔ میں مجبوراً جاگتا رہا۔ اور ہر رات جاگنے لگا۔ کیونکہ وہ میرا دل۔ میری نیندیں میرے خواب اور میری راتیں ہمراہ لے گئی تھی۔

میں وعدہ کے مطابق نورافشاں سے پھر ملا، اور بار بار ملتا رہا۔ بار بار ملتے رہنے سے گہری دوستی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔ لیکن دوستی کے آگے بھی ایک منزل تھی۔ جہاں میں نورافشاں کے ساتھ پہنچنے کے لئے بےقرار تھا۔ مجھے اس کی گہری رفاقت تو حاصل تھی لیکن میرا دل رفاقت کے علاوہ کسی اور چیز کے لئے بھی دھڑک رہا تھا۔

لیکن نور افشاں جیسے تھک کر صرف دوستی کی منزل پر ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں ہر روز اس کی بارگاہ ناز میں پہنچنے سے پہلے بڑے ارادے باندھا کرتا تھا لیکن اس کے سامنے پہنچ کر میری ہمت گونگی ہو جاتی۔ میں خود گونگا ہو جاتا اور مجھ میں اتنی سکت بھی باقی نہ رہتی کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہہ دوں۔

"آؤ نور — آگے چلتے ہیں اس سے آگے بھی ایک منزل ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟"

دوستی کی منزل پر تھکی ہاری بیٹھی نور افشاں مجھے سنگ مرمر کا ایک مجسّمہ معلوم ہوتی تھی، بے حس، جس کے پہلو میں دل نہیں ہے، جس نے زندگی کی پچیسویں بہار میں ایک نوجوان مرد کی رفاقت کے باوجود کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس کی گرگابی کی چاپ اس کے رفیق مرد کی دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہے اس کی آنکھوں کی گولائی میں کسی کی ساری دنیا سمٹ آئی ہے۔ کاش نور افشاں نور افشاں ہی ہوتی — وہ نور افشاں ایم۔ اے نہ ہوتی ورنہ پھر میری زندگی کا وہ سب سے زیادہ قیمتی لمحہ مجھے مل جاتا۔ جب میری ایک بات پر اس کے گال سرخ ہو جاتے۔ اسکی پلکیں جھک جاتیں، اور اس کی بغلیں پسینے سے بھیگ جاتیں — عورت اور مرد کی زندگی میں پہلی بار جو کوئی لمحہ آتا ہے اس کے بارے میں نور افشاں کا عجیب غریب

نظریہ تھا۔ اس نے جیسے میرے دل پر ایک گھونسہ مار کر کہا تھا کہ اے نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت بغیر کسی جنسی رشتے کے بھی وہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ـــــ رہ سکتے ہیں۔ پھر نہ جانے کیوں ہمارا سماج عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور رکھے ہوئے ہے کہ صرف شادی ہی انھیں ایک دوسرے کے قریب لا سکتی ہے ـــــ اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب تو عورت جاہل نہیں رہی۔

میں نے دل ہی دل میں کڑھ کر کہا

کاش نور افشاں تم کبھی اپنے آپ کو غور سے آئینے میں دیکھو۔ چست جسم والی بہت لمبی نور افشاں تمہارے بال شفق کے غبار کی طرح سُرخ ہیں تمہاری آنکھیں گہری جھیلوں کی طرح نیلی ہیں۔ تمہاری کمر بید کی طرح لچکتی ہے پری چہرہ نور افشاں تمہارا جسم سرخ گلابوں کے رنگ سے رنگا ہوا ہے۔ لیکن تم فلسفے کی اس خشک کتاب کی طرح ہو جس پر بڑا رنگین اور دلآویز گردپوش منڈھا ہوا ہے۔ اور پھر اگر ایسا ہے تو پھر تم میری نیندوں کے ڈھیر اپنی خوابگاہ میں کیوں جمع کر رہی ہو۔ اور یہ کیا مذاق ہے کہ تم خود تو بڑے آرام سے سو جاتی ہو لیکن اپنی یادوں کی بھوتنے میرے پاس بھیجدیتی ہو جو رات بھر جھنجھوڑ جھنجوڑ

کر جگاتے رہتے ہیں۔

نور — مجھ پر رحم کر دیں دوستی کی منزل پر ٹھہرے اکتا گیا۔

ہوں۔ اٹھو آؤ۔ اب آگے چلتے ہیں

ایک دن میں نے بڑی ہمت کر کے نور افشاں سے پوچھ ہی لیا

"نور — کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں ہے؟"

نور افشاں نے ایک دو لمحے کے لئے گھور کر میری آنکھوں میں

— آنکھیں ڈال دیں۔ میری آنکھوں سے اس وقت میرا دل جھانک رہا تھا

— نور افشاں نے شاید پہلی بار میری آنکھوں میں میرے دل کو دیکھا اور

معاً بڑی سنجیدہ ہو گئی ۔ اور کافی دیر بعد بولی۔

"کیوں نہیں — آخر میں بھی جوان ہوں، پہلو میں دل رکھتی ہوں۔"

یہ جواب سن کر اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کے طاق میں

بجھتی ہوئی شمع ایک دم بھڑک اٹھی ہے۔ میرا تنفس تیز ہو گیا۔ میں اپنے آپ پر

قابو نہ پا سکا۔ کیا وہ میں ہوں؟ میرے ارگرد جیسے زبردست طوفان کے

جھکڑ چل رہے تھے۔ اور میرے دل کے طاق میں جلتی ہوئی شمع ،

جھلملا رہی تھی ۔

میں نے پوچھا

" کیا تم اپنے محبوب کا نام بتا سکتی ہو ؟"

اس نے عجب اداس سی مسکراہٹ سے ـــــ میری طرف دیکھا جو میرے سوال اور اس کے جواب کے درمیان تھے گویا میرے لئے زندگی اور موت کے لمحے تھے ۔ نورافشاں کس کا نام لے گی ۔ طوفان بڑھ رہا تھا ۔ نورافشاں میرا نام لے گی ۔ طوفان بہت تیز ہو گیا ۔ نورافشاں میں صبر برداشت کے آخری سرے تک پہنچ چکا ہوں ۔ طوفان اپنے عروج تک پہنچ چکا تھا ۔ میرا نام لے لے کر نورافشاں !! مجھے زندگی دے دے نورافشاں !!!!

میں نے جیسے طوفان کے اندھیرے میں سے نورافشاں کو آواز دی

" نورافشاں ۔ مجھے اس کا نام بتا دو ۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا ۔"

نورافشاں نے آہستگی سے جواب دیا

" اس کا نام نورافشاں ہے !"

میں نے تڑپ کر کہا ۔

"مذاق نہ کرو نورافشاں ؟"

نورافشاں کے چہرے پر نہ مسکراہٹ تھی اور نہ بشاشت، ایک دم سنجیدہ اور کھنچا ہوا چہرہ ۔ اس نے جواب دیا۔

"سچ سچ میں اپنے سوائے کسی سے محبت نہیں کرتی۔ میں اپنی آپ عاشق ہوں۔ میں گھنٹوں بڑی محویت کے عالم میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے آپ کو دیکھا کرتی ہوں۔"

طوفان بہہ نکلا تھا۔ طوفان کم ہو رہا تھا۔ پتھر عورت! میں بڑی بے چینی کرب اور آزار میں مبتلا گھر لوٹ آیا۔ اور میں نے اسے پہلی بار ایک بے حد جذباتی خط لکھا۔ میں نے بغیر کسی تمہید کے صاف صاف اسے بتا دیا کہ میں اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں ۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میں اس کے بغیر زندہ رہنے کو زندگی نہیں سمجھتا ہوں، میں جواب چاہتا ہوں آخری اور فیصلہ کن جواب!

دوسرے ہی روز مجھے فیصلہ کن جواب مل گیا۔ طوفان بالکل اتر چکا تھا۔ اور مایوسی کے خس و خاشاک میں نورافشاں کے ہاتھ سے لکھا ہوا کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ لیکن اس کا صرف ایک ہی جملہ تیر کی

طرح میرے دل میں چبھا۔ نورافشاں نے لکھا تھا۔

"...... نہ جانے کیوں مجھے کالا رنگ پسند نہیں ......"

میں نے اس جملے کے تیر کو اپنے دل سے نکالنے کے لئے آئینہ اٹھایا اور فرش پر زور سے پٹخ کر چیخا

" نور۔ اب بولو۔ میں نے اپنے رقیب کو سامنے سے ہٹا دیا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ اب تمہارا محبوب کون ہے؟ اب تم محویت کے عالم میں گھنٹوں کسے دیکھا کرو گی؟"

آئینہ اپنے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کا قہقہہ مجھ پر پھینک کر کہہ رہا تھا "پاگل۔ میں تمہارا رقیب نہیں۔ تمہارا دشمن تو کوئی اور ہے۔ تم نے مجھے مار ڈالا۔ لیکن تمہارا دشمن تو ابھی تک تم سے چمٹا ہوا ہے۔"

میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے دل کی ساری شمعیں بجھ گئی تھیں، اور میں گھور اندھیرے میں بھٹک گیا تھا ۔۔ اسی اندھیرے میں تین سال تک بھٹکتے بھٹکتے ایک دن نورافشاں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ اسکی گود میں ایک بچہ تھا۔ سرخ بال نیلی آنکھیں۔ سرخ گلابوں کے رنگ سے رنگا ہوا جسم۔ نورافشاں نے بچہ کو میری گود میں دیتے ہوئے کہا ۔۔

" یہ میرا پہلا بچہ ہے آعظم۔ تم نے اس کے باپ کو نہیں دیکھا - یہ ہو بہو اپنے باپ جیسا ہے۔ آؤ میں تمہیں اس کے باپ سے ملاؤں ۔۔۔ !"

لیکن میں اس کے باپ سے ملے بغیر کالے بھیانک اندھیروں میں لوٹ آیا۔

دکھاوا

بڑی بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر مجھے رائل پارک کے محلے میں دو کمروں
کا ایک بہترین فلیٹ مل گیا۔

یہ فلیٹ ایک سابق فلم ایکٹریس کی نو تعمیر بلڈنگ "جزیرۂ شاہدہ" کی
دوسری منزل پر تھا۔ موڈرن طرز کی بلڈنگ جس میں دو بڑے کمرے تھے جس کی
دیواروں کی سنگ مرمر جیسی پلستر پر نخلستانوں اور اونٹوں کے کارواں، کھجور
کے درختوں، سائیکی کے عکس اور عمر خیام اور اس کی ماہ پارا ساقی کی شراب نوشی
کی دلآویز "پینٹنگ" نے اس فلیٹ کو، جیسے کسی مصور کا اسٹوڈیو یا کسی عیاش شاہزادے
کی خواب گاہ بنا دیا تھا ——— دوسرے کمرے کے پیچھے جدید طرز کا ایک باتھ روم
تھا۔ جس کی آدھی دیواریں اور فرش چینی کی سفید ٹائلوں سے چنی گئی۔

تھیں، سیزرننگ کے جیڈ کا ایک نہانے کا لمبا سا ٹب تھا جس پر ٹھنڈے اور گرم پانی کے شاور اپنی لمبی لمبی گردنیں جھکائے ہوئے منہ دھونے کے بیسن کے اوپر انسانی دل کی شکل جیسا ایک چمکیلا جلبی آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس باتھ روم اور اس کے بالمقابل باورچی خانہ کے درمیان ایک بیضوی قسم کا برآمدہ تھا۔ جہاں میں نے اپنی کھانے کی میز لگائی ہوئی تھی۔

فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد میں نے اپنے پنجابی باورچی اسحٰق کی مدد سے اس کی صفائی کی، اور سیرز جنکشن فرسرز کے یہاں سے کرایہ پر لائے ہوئے جدید طرز کے فرنیچر سے دن بھر اس کو سجاتا رہا۔ سہ پہر کو نہا دھو کر جب میں پچھلے برآمدے میں کھانے کی میز پر بیٹھا گرم گرم کافی پینے لگا تو اچانک میری نظر سامنے والی بلڈنگ کی ایک کھڑکی پر پڑی جس میں ایک سانولی لڑکی کھڑی تھی۔

جیسے ہی اس نوجوان لڑکی سے میری آنکھیں ٹکرائیں وہ لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ لیکن اسی طرح ہٹی کہ اس کا ایک کندھا اور ہاتھ مجھے نظر آتے رہے جیسے وہ وہاں سے یعنی میری نظروں کے سامنے سے ہٹنا تو نہیں چاہتی لیکن کوئی بات مانع ہے۔ شاید پاکستانی نوجوان لڑکی کی مشالی شرم یا پھر گھر کے

بڑے بوڑھے لوگ ـــــ جس کے باعث وہ لڑکی صاف چھپتی بھی نہیں

سامنے آتی بھی نہیں ـــــ!

لڑکی معمولی خدوخال کی تھی لیکن بھرپور طور پر جوان تھی۔ ایسی لڑکی

جس پر پہلی نظر پڑتے ہی ایک عام نوجوان فوراً دلچسپی کا اظہار کر دے۔

جب وہ لڑکی کھڑکی کی اوٹ سے بالکل ہی ہٹ گئی تو میں نے بلڈنگ کا جائزہ

لینا شروع کر دیا۔ وہ ایک بہت پرانی اور بوسیدہ بلڈنگ تھی جس کی

دیواروں پر سفیدی شاید اسی وقت کرائی گئی ہو جب اسکی تعمیر مکمل ہوئی ہو

ـــــ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور جہاں پلستر باقی رہ گیا تھا

وہاں چہرے کی خوبصورتی بڑھانے والی کریمو، بالکل صفایا ؤڈر اور قوت مردمی

بحال کرنے والی دواؤں کے اشتہارات لکھے ہوئے تھے۔ لاتعداد بارشوں

نے اس بلڈنگ کا حلیہ مکمل طور پر بگاڑ رکھا تھا۔ بلڈنگ کی کھڑکیاں پرانی وضع

کی تھیں پرانی ساگوانی لکڑی کے چوکھٹ جس میں زنگ آلود لوہے کی لمبی لمبی

سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ بیشتر کھڑکیوں کے دروازوں کے تختے اور شیشے

ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور ایسی ہی ایک کھڑکی سے ایک سانولی سلونی بھرپور جوانی

جھانک کر ابھی ابھی چھپ گئی تھی۔

میں نے اس تسانولی کے بارے میں اور قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔ پہلی بات جو میں سوچ سکا وہ یہ تھی کہ وہ لڑکی جو چہرے سے بیس پچیس سال کی جوان معلوم ہوتی ہے ابھی کنواری ہے اسی لئے کھڑکی سے جھانکا کرتی ہے دوسری بات یہ کہ کنواری اس لئے ہے کہ وہ جس بلڈنگ میں رہتی ہے وہ بہت پرانی اور بوسیدہ ہے، یعنی ایسی پرانی اور بوسیدہ بلڈنگوں میں بالعموم غریب اور نچلے متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں اور غریب یا نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام گھر کی جوان بیٹی کی شادی ہوتا ہے۔ غالباً اس لڑکی کا باپ بھی کوئی کلرک یا چھوٹا موٹا دکاندار ہوگا ــــ ابھی میں تیسری بات سوچ ہی رہا تھا کہ میرا باورچی اسحٰق کافی کے برتن اٹھانے کے لئے آیا اور مجھے پھر اس کھڑکی طرف دیکھتے ہوئے بے حیائی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"باوجی ــــ اچھی جگہ آگئے ہیں، ادھر سامنے تو ایک بڑی خوبصورت لڑکی رہتی ہے۔ یہاں آتے ہی سب سے پہلے میں نے اسے دیکھا ہے۔ اب تک آپ نے بھی دیکھ لیا ہوگا ــــ کیوں باؤجی ــــ؟"

اسحٰق ان معاملات میں میرے نوکر کے بجائے میرا بے تکلف یار بھی واقع

ہوا ہے۔ لیکن مجھے اس وقت اس کی بے تکلفی سخت ناگوار گزری اور میں نے
اسے درشت لہجے میں ڈانٹ دیا
"اوئے ساہکی (اسحاق کا پنجابی مخفف) کے بچے کان کھول کر سن لے
یہ شریفوں کا محلہ ہے خبردار جو تو نے یہاں آئندہ کبھی کسی کی بہو بیٹی کو تاکا۔
کھال کھینچ کر بھس بھر دوں گا کمینہ۔"
اسحٰق پر عادتاً اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ فطری مسخرے
انداز میں اپنے بڑے بڑے پیلے دانت نکال کر ہنستا ہوا کانی کی چھوٹی ٹرے
اٹھائے باورچی خانے میں چلا گیا۔
مجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا تھا میں چلا گیا اور رات دیر
سے لوٹا۔ اس وقت وہ بوسیدہ بلڈنگ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف
اس لڑکی کے کمرے کی بند کھڑکی کے شیشوں سے مٹی کے تیل کی مدھم سی روشنی
چھن رہی تھی
صبح سویرے جب نہانے کے لئے برآمدے سے گزر کر میں باتھ روم میں
جانے لگا تو میری نظر اس کھڑکی پر پڑی۔ اس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔
وہی سانولی لڑکی ایک انے جیسے سانولے نوجوان کے سامنے کھڑی تھی — نوجوان

نے اپنا ہاتھ بڑھایا ہوا تھا ... اور وہ لڑکی سر جھکائے ہوئے اسکی آستین کا بٹن ٹانک رہی تھی میں نے سمجھا شاید وہ اس کا بھائی ہے جو روزگار پر جانے کے لئے تیار ہو چکا ہے اور جلدی میں قمیض اتارے بغیر اپنی استین کا بٹن اپنی بہن سے ٹنگوا رہا ہے۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے دانتوں کو برش کرنا شروع کر دیا تاکہ انہیں شبہ نہ ہو کہ میں انہیں دیکھنے کے لئے کھڑا ہوں۔ وہ لڑکی جب آستین کا بٹن ٹانک چکی تو نوجوان نے کھڑکی سے میری طرف دیکھا اور جلدی سے اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر لئے اور پھر کھڑکی کے گرد آلود مدھم شیشوں سے مجھے یوں نظر آیا جیسے اس نوجوان نے اسے اپنی دونوں باہنوں میں جکڑ لیا ہو۔

اس کے بعد وہ نوجوان خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا — میں بھونچکا رہ گیا — یہ کیا — ؟

پھر کھڑکی کھلی۔ اس وقت اس لڑکی کے سانولے گال گرم لوہے کی طرح دہک رہے تھے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی جو سائکل پر سوار ہو رہا تھا — وہ لڑکی پھر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس حالت میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی غیر مرد اسے دیکھے۔

میں نہاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر وہ نوجوان اس لڑکی کا شوہر ہے تو پھر یہ لڑکی اس طرح اس کی عدم موجودگی میں ایک غیر مرد کے سامنے کیوں بار بار آتی ہے اور ایسی چور آنکھوں اور کنکھیوں سے کیوں دیکھتی رہتی ہے؟

نہانے کے بعد جب میں ناشتہ کی میز پر بیٹھا تو وہ لڑکی پھر اسی "صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں" کے انداز میں کھڑکی میں کھڑی کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ میرا باورچی اس وقت ناشتہ لے آیا۔ اس نے کنکھیوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف غالباً اسے شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھکا کر گردن کھجاتے ہوئے کہا

"باؤجی۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل آپ خفا ہو گئے۔ سچ مچ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ لیکن میں آپکو قول دیتا ہوں کہ آئندہ سے میں کبھی کسی کی بہو بیٹی کو تاکا نہیں کرونگا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ اسحٰق نے مجھ پر پانی کی ایک بالٹی الٹ دی ہے لیکن میں چونکہ اس کی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔ اس لئے مسکراہٹ کو ضبط نہ کرتے ہوئے بولا ——

"کیوں بے ساہکی! مجھی پر چوٹ کر رہا ہے۔ باز آ اپنی بیہودگیوں سے ورنہ سڑکیں ناپتا پھرے گا۔!"

اسحق نے چونکہ مجھے جھیپ کر مسکراتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس لئے بڑے اطمینان سے ایک لمبی سانس لے کر جواب دیا۔

"سچ ہے باؤ جی! امیر آدمی کسی کی بہو بیٹی کو کچھ بھی کرے تو کوئی بات نہیں لیکن غریب آدمی کسی غیر عورت کو ذرا سا دیکھ لے تو بس وہ گناہگار ہو گیا آپ سچ کہتے ہیں۔"

میں نے اسحق کی اس نکتہ چینی کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اور میں "محمود غزنوی اور ایاز" قسم کے آقا و نوکر تھے۔ لیکن میں ناشتہ کرتے کرتے یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ موجودہ زمانے کے غریب آدمیوں میں طبقاتی امتیاز اور امیری و غریبی کے فرق کا شعور کس شدت سے پیدا ہوتا جا رہا ہے۔!

ناشتہ کے بعد دفتر جاتے ہوئے میں نے اسحق کو بلایا اور مصنوعی غصہ سے بولا ۔۔۔

"او اے رانی خاں دے سالے! سالے میں تجھے اس وقت معاف نہیں کرونگا جب تک کہ تو آج شام تک اس لڑکی کے بارے میں ساری

"ضروری معلومات" نہ حاصل کرے۔

شام کو اسحٰق نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کا نام "تاج بی بی" ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس بلڈنگ میں اکیلی رہتی ہے۔ ماں باپ ان دونوں گوجرانوالہ میں آڑھتی کی دکان کرتے ہیں۔ شادی ابھی چار مہینہ پہلے گوجرانوالہ میں ہوئی ہے۔ اور شوہر لاٹ صاحب کے دفتر میں ٹائپسٹ کلرک ہے

میں نے اسحٰق سے کہا ــــ

"ابے اواؤ کے سوتیلے بھائی اتنی معلومات تو میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر معلوم کر لی ہیں۔ لیکن یہ تو بتا یہ کھڑکی کیوں بند ہے؟ میری عدم موجودگی میں تو نے اس لڑکی کو چھیڑا تو نہیں؟"

اسحٰق نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا ــــ

"توبہ توبہ باؤ جی! کسم رب دی جو میں نے کبھی اس کھڑکی کی طرف دیکھا ہو۔"

عین اسی وقت دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ اسحٰق نے دروازہ کھولا اور بولا ــــ

"صاحب ایک برقعہ پوش عورت اور تین نوجوان آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں دروازے پر گیا اور کالیڈر کی روشنی جلائی تو ان تین نوجوانوں میں سے ایک کی شکل کچھ جانی پہچانی معلوم ہوئی ــــ لیکن میں اسے پہچان نہ سکا ــــ میں نے ان لوگوں سے پوچھا۔

"فرمائیے آپ لوگ کون ہیں اور مجھ سے کیا کام ہے؟"

بجواب دینے کے بجائے نوجوان نے برقع پوش عورت سے پوچھا

"بتا ان دونوں میں سے کون ہے؟"

برقع پوش عورت نے اسحٰق کی طرف اشارہ کیا تو اس نوجوان نے کہا

"بابو جی آپ اس شخص کو میرے حوالہ کریں، ہم اسے پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہیں۔"

میں نے سبب پوچھا تو اس نوجوان نے بتایا کہ اسحٰق دن بھر اس لڑکی سے اشارہ بازی کرتا رہا ہے! میں نے انھیں سمجھایا بجھایا اور کہا ــــ

"آپ مطمئن رہئے۔ میں ابھی ابھی اس کو نوکری سے الگ کئے دیتا ہوں ــــ یہ پولس وولس میں آپ جائیں گے تو خواہ مخواہ آپ کی بدنامی بھی ہوگی نہ یہاں رہیگا اور نہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع ملے گا۔"

یہ کہہ کر میں اندر گیا اور اسحٰق کا بستر اور ٹرنک اٹھا لایا۔ اس کی باقی ماندہ

تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر میں نے اس کے نیم گنجے سر پر دو تین ہاتھ
رسید کئے اور بولا ـــــ
بھاگ جاؤ یہاں سے کمینے "
اسحق بڑبڑاتا ہوا اپنا سامان اٹھا کر سیڑھیاں اتر گیا اور وہ نوجوان
اور اس کے ساتھی میرا شکریہ ادا کر کے سیڑیاں اترنے لگے سب سے پیچھے
وہ برقعہ پوش لڑکی تھی۔ لیکن اس نے نظریں بچا کر اپنا نقاب اٹھایا ۔ مجھے
ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور پھر نقاب ڈھانپ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ
سیڑھیاں اتر گئی ۔
یہ کیا ـــــ؟
یہ نقاب اٹھا کر مجھے دیکھنا ـــــ!
یا تو یہ اشارہ بازی کی شکایت لے کر میرے پاس آئی تھی ـــــ اور
خود ہی اشارہ بازی سے باز نہیں آتی ۔!

رات بھر میں اس پہیلی جیسی لڑکی کو حل کرتا رہا۔ لیکن اس کے کردار
کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا ۔

صبح جس وقت میں جاگا تو کھڑکی بند تھی۔ نہا دھو کر میں ہوٹل میں ناشتہ کرنے چلا گیا۔ موسم صبح ہی سے خوشگوار ہو گیا تھا۔ عجب گھرے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نو بج رہے تھے لیکن سورج کا کہیں پتہ نہیں تھا

یہ میری عادت ہے جب آسمان پر کالے کالے بادل چھا جاتے ہیں تو میں کام پر نہیں جاتا۔ شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا ہوں۔ ہوٹل سے ناشتہ کر کے نکلتے ہی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اسلئے میں اپنے فلیٹ لوٹ آیا اور کھانے کی میز والے برآمدہ میں آرام کرسی بچھا، موپاساں کے افسانے پڑھنے لگا۔ کیونکہ جب آسمان پر کالے کالے بادل خوب گھر گھر چھائے ہوں، اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو، اور زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو لپٹیں اٹھ رہی ہوں تو یا تو گرم گرم پکوڑے مزا دیتے ہیں یا اسکاچ وہسکی کے جام۔ اگر یہ دونوں چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر موپاساں کا افسانہ ان دونوں کی کمی پورا کر دیتا ہے

ابھی میں نے ایک افسانے کی پہلی تین چار سطریں بھی نہ پڑھی تھیں کہ کھڑکی پھر کھلی۔ وہی لوٹ گئی ہے!

اس نے اب کی بار پوری آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن اس کے چہرے

پر نہ شرم کی لالی آئی اور نہ اس کی پلکیں جھپکیں — اس کی بڑی بڑی گول گول آنکھیں بالکل گونگی تھیں، پھر وہ ہٹ گئی — وہی صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں، والا نرالا انداز —

میں کل کے حادثے سے واقف تھا۔ اس لئے میں بھی اسے کوئی اشارہ کرنے کی جسارت نہ کر سکا۔ صرف اسے کبھی کبھار کنکھیوں سے دیکھ لیا کرتا تھا

وہ بار بار کھڑکی کے سامنے آتی۔ وہیں اس نے بالوں میں کنگھی کی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی لباس تبدیل کیا اس دن شام تک اس نے پانچ لباس تبدیل کیئے۔ محض مجھے دکھانے کے کئے — کبھی اپنا سرخ عروسی جوڑا پہنا کبھی شلوار قمیض۔ کبھی غرارہ اور قمیض۔ کبھی ساڑی اور چولی — ایک بار، اس نے اپنا سارا زیور جسم پر سجایا۔ اس کے بعد وہ گھر کی ایک ایک قیمتی چیز کھڑکی کے سامنے لاتی رہی۔ کبھی چاندی کا پاندان، کبھی گل دان اور کبھی گراموفون وہ انہیں جھاڑنے پونچھنے کے بہانے کھڑکی کے سامنے لاتی۔ مگر دراصل وہ مجھے دکھانا چاہتی تھی کہ دیکھ تو میں کتنی مالدار ہوں۔ لیکن وہ اپنی اس دولت کا مجھ پر کیوں رعب گانٹھنا چاہتی ہے۔

اس طرح کچھ دن گذر گئے۔ وہ لڑکی اور میں ایک دوسرے کو بے حجابانہ دیکھنے لگے۔ جب اس کے شوہر کا دفتر سے واپس ہونے کا وقت آتا تو وہ، کھڑکی بند کر لیتی۔ اور صبح جب اس کا شوہر دفتر چلا جاتا تو کھڑکی کھل جاتی۔ اتوار کی چھٹی کے دن کھڑکی سارا دن بند رہتی۔ لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد میں نے سوائے دیکھنے کے اور کوئی سلسلہ شروع نہیں کیا۔ میں صرف وقت گذاری چاہتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ لڑکی ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا پتہ اگر میں اس کو اشارہ کر دوں تو وہ پھر محلے بھر کو اکٹھا کر کے میرے گھر پر چڑھ دوڑے۔

بہر حال اس سارے عرصہ میں اس نے اپنے گھر کے سارے ملبوسات اور چیزوں کی نمائش مکمل کر لی اور مجھے بتا دیا کہ اس کے پاس بہت قیمتی لباس چاندی کے برتن، فرنیچر، ایک وال کلاک، اور ایک عدد گراموفون بھی ہے۔

اسی زمانے میں، ایک رات میرا ایک دوست کہیں سے ایک بہت خوبصورت اور بہت تعلیم یافتہ لڑکی کو اغوا کر کے سیدھے میرے گھر لایا اور یہ کہہ کر اسی رات کہیں چلا گیا کہ یہ لڑکی اس کی ایک امانت ہے، وہ چھ سات دن کے اندر اندر

آئے گا۔۔۔ اور اس لڑکی کو ہمراہ لے جائے گا۔ لیکن پانچویں دن میں نے اور
اس تعلیم یافتہ لڑکی نے اخباروں میں ایک خبر پڑھی کہ میرا وہ دوست لڑکی کے
اغوا کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا، اور حوالات میں اس نے خودکشی کرلی ہا
وہ تعلیم یافتہ لڑکی اس دن بہت روئی۔ لیکن پولس لڑکی کے تلاش میں تھی
اس لئے میں نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے والدین کے گھر چلی جائے۔ لیکن
لڑکی خوف زدہ تھی۔۔ اس نے بتایا کہ وہ عزت دار لڑکی ہے۔ اگر وہ گھر
جائے گی تو اس کے غیور والدین اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔
اب صرف ایک راستہ تھا کہ میں اس سے شادی کرلوں، چنانچہ دوسرے
ہی دن ہم دونوں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہوئے۔
لڑکی بالغ تھی، عدالت نے ہم دونوں کو شادی کی اجازت دیدی اور
تیسرے ہی دن میں نے اس سے شادی کرلی۔ لڑکی بڑی خوبصورت سمجھدار اور
کافی پڑھی لکھی تھی۔ ہم دونوں شادی کے پہلے ہی ہفتے بے تکلف ہو گئے
شادی کے بعد بوسیدہ بلڈنگ والی لڑکی ہم دونوں کو برابر دیکھتی رہی
اور اس کی آنکھوں میں عجب سی خوشی کی جھلک ہوتی۔
اس لڑکی کی یہ حرکت میرے لئے بڑی باعث حیرت تھی۔ وہ مجھے پہلے

اس طرح گھورتی تھی جیسے اس کو مجھ سے محبت ہے۔ اور میری نظروں کے سامنے آئے بغیر اسے چین نہیں آتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد میرا خیال تھا کہ اس کی آنکھوں میں اُداسی اور مایوسی ہوگی۔ اور وہ کبھی مجھے نہ دیکھے گی۔ وہ کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند کر دے گی۔ لیکن اس عجیب و غریب لڑکی نے میری ایک بھی توقع پوری نہ کی۔

میں نے اپنی بیوی سے راز چھپانا مناسب نہ سمجھا، اور اسے سب کچھ اس لڑکی کے بارے میں بتا ڈالا۔ اور پھر اس سے خواہش کی کہ تم ذرا یہ معلوم کرو کہ یہ لڑکی آخر مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ بخدا میری یہ الجھن دُور کرو۔

چنانچہ دوسرے دن جب میں اور میری بیوی ناشتہ کر رہے تھے تو وہ لڑکی معمول کے مطابق کھڑکی میں آگئی۔ اور میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا اور بولا "میں اخبار کے بہانے اندر کمرے میں جاتا ہوں، تم اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دو۔ دیکھو تو کیا جواب دیتی ہے۔"

میں جب اپنے کمرے میں جا کر دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا تو میری بیوی نے با آواز بلند کہا۔

"بہن تم ہمارے پڑوس میں رہتی ہو، تم بھی اکیلی ہو ــ اور میں بھی دن بھر

اکیلی رہتی ہوں۔ کبھی گھڑی دو گھڑی کے لئے یہاں آجاؤں تو دل بہلے۔"
اس لڑکی نے ہونٹ سکیڑ کر بڑی رعونت سے کہا۔
"واہ! میں کیوں آپکے گھر آؤں، اس لئے کہ آپ امیر لوگ ہیں اور ہم غریب! پہلے آپ ہمارے گھر آئیے تو بعد میں میں آپ کے گھر آؤں گی۔"
میری بیوی نے ہنس کر جواب دیا
"اس میں امیری غریبی کا کیا سوال ہے۔ اچھا لو۔ ایک گھنٹہ بعد میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔"
لڑکی شاید غریبی کی امیری پر اس فتح سے خوش ہوئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔
ضرور آئیے۔ گھر آپ ہی کا ہے۔"
میرے دفتر جاتے وقت میری بیوی نے کہا
"سن لیا۔ کتنی مغرور لڑکی ہے۔ کسقدر شدید احساس کمتری میں بتلا ہے۔"
میں مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور دفتر تک راستہ بھر میں یہ سوچتا رہا

کہ یہ اس لڑکی کا احساس کمتری نہیں بلکہ اس جاہل لڑکی میں طبقاتی امتیاز کا ایسا گہرا شعور پیدا ہو گیا ہے جو طبقاتی امتیازات کو مٹا کر ساری دنیا کے انسانوں کو ایک جیسا بنا دینا چاہتا ہے۔

رات کو جب میں گھر لوٹا تو میری بیوی بہت ہنس ہنس کر اس لڑکی سے ملاقات اور اس کی جہالت، احساس کمتری اور غرور کے واقعات سناتی رہی۔ چنانچہ جب میری بیوی نے یہ سنایا کہ وہ لڑکی ہمیشہ بن سنور کر میرے سامنے اس لئے آتی رہی کہ میں اسے بدصورت نہ سمجھوں —— اور وہ اپنے گھر کی قیمتی چیزوں کی اس لئے میرے سامنے نمائش کرتی رہی کہ میں اسے غریب نہ سمجھوں۔ اور اس نے میرے نوکر کو اس لئے نوکری سے نکلوایا کہ اسے ایک نچلے درجے کے انسان کی اشارہ بازی یا گھورنا اس لئے پسند نہیں کہ میں کہیں اسے نچلے درجے کی عورت نہ سمجھوں، تو میں بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا لیکن فوراً میں سنجیدہ ہو گیا۔ میری بیوی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا

"یہ آپ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ کیوں ہو گئے؟"

میں کھڑکی سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا ــــ
"میں اس لڑکی کے اُن دکھاوے میں دنیا کا بڑا ہی شاندار مستقبل
دیکھ رہا ہوں ــــ اس لڑکی کا یہ طبقاتی شعور مجھے ......"
میری بیوی نے نیند سے بوجھل پلکوں کو مسلتے ہوئے کہا۔
"آپ بیٹھے یوں ہی دور کی کوڑیاں لاتے رہئے میں تو اب سوتی ہوں"
میری بیوی بستر پر گر کر سو گئی اور میں نے پچھلے برآمدہ والی کھڑکی
کھولی تو دیکھا کہ غریب لڑکی کے کمرے کی بند کھڑکی کے شیشوں سے مٹی
کے تیل کی مدھم روشنی جھانک کر میرا اور اندھیرے کی منہ چڑھا رہی ہے۔

گوری عورت کالا مرد

ہوائی جہاز میں سوائے میرے اور ایک نوجوان بری لڑکی کے سارے
مسافر انگریز، امریکی یورپی باشندے تھے۔ اس لئے ہوائی جہاز بھی آسمانوں میں
اڑنے کے باوجود زمین کی مخصوص ملکی اور قومی تقریبات میں بٹا ہوا تھا۔ انگریز
صرف انگریز مسافروں سے باتیں کر رہے تھے۔ امریکی عورتیں صرف امریکی مردوں
کے لئے مسکرا رہی تھیں اور یورپی باشندے صرف یورپی باشندوں سے
ہم کلام تھے۔ جیسے یہ لوگ نہ انسان ہیں اور نہ مسافر۔ یا پھر وہ زندگی کا سفر
ہو یا آسمانوں کا سفر ہر جگہ امریکی زیادہ اور انسان کم یا پھر پہلے انگریز اور
یورپی اور بعد میں مسافر ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا ہوائی جہاز کمپنی والوں
کا مخصوص رنگی و نسلی تنفر کہ انھوں نے میرے ساتھ والی نشست کسی امریکی انگریز یا

یورپی باشندے کو دینے کے بجائے اس نوجوان برمی لڑکی کو دیدی تھی جس
کے جسم کا رنگ بھی میری طرح گندمی تھا اور جو میری طرح ایک ایشیائی باشندہ تھی
ہوائی جہاز میں ۸۵ مسافروں اور انسانوں کے موجودگی کے باوجود میں
اور شاید وہ نوجوان برمی لڑکی بھی انسانی سے یوں اجنبیت محسوس کر رہے تھے
جیسے ہم ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ رد بن سن کروسو کے جزیرے میں پہنچ
گئے ہیں۔ یہ شاید ۸۵ انسانوں کے ہجوم میں گھرے رہنے کے باوجود تنہائی کی شکایت
یا واضح طور پر محسوس ہوتا ہوا رنگی و نسلی تنفر ہی تھا جس نے مجھے اور اس نوجوان
برمی لڑکی کو بغیر کسی رسمی تعارف کے متعارف کرادیا تھا اور ہم دونوں ایک
دوسرے کے ایسے دوست بن گئے تھے کہ ہمارا سامنے والا امریکی جوڑہ غالباً
ہمیں میاں بیوی سمجھ رہا تھا۔

اس نوجوان برمی لڑکی کی رفاقت میں کراچی سے رنگون تک میرا سفر مزے
سے کٹ گیا۔ یوں بھی ایک نوجوان لڑکی کا قرب اور اس سے بات چیت ایک
نوجوان مرد کے لئے سب سے اچھا پاسٹ ٹائم ہوتا ہے۔ لیکن اس لڑکی کا
قرب اس سے دوستی اور اس سے بات چیت اس لئے بھی یادگار ہے کہ وہ
لڑکی برما کی ایک ترقی پسند عورت تھی برما کے ایک ترقی پسند اخبار کی رپوٹر جو برطانیہ

اور یورپ کے ایک طویل دورے کے بعد برباوٹ رہی تھی — وہ لڑکی بجائے خود ایک نیا برما تھی۔

رنگون کے منگلاڈون ہوائی اڈے پر وہ لڑکی مجھ سے جدا ہوگئی۔ مجھے اس لڑکی سے جدا ہونے کا کوئی افسوس نہیں تھا البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی مجھے دو ہزار چار سو میل کا سفر طے کرنا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں اور ہوائی جہاز میں نسلی برتری کی آنکھوں کے شرارے ہیں اور رنگی تنفر کا سانپ پھنکار رہا ہے۔

رنگون سے ہانگ کانگ تک اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے میکسم گورکی کے کرداروں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور بیئر پیتے اور اپنی نشست پر اونگھتے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔

لیکن ہانگ کانگ پہنچنے اور ہانگ کانگ کے سب سے بڑے اور شاندار ہوٹل "کاؤلون ہینسولا ہوٹل" میں ٹھہرنے کے باوجود میرا سیاہ فام جسم سفید رنگ انسانوں کے ہجوم میں تنہا تھا۔ اور نگاہ لالہ رخاں میری سیاہ پتلیوں سے ٹکراتی ہی نہ تھیں۔

ایک رات اور ایک دن گذر گیا تھا۔ تنہائی اور اگر دسارے کے سارے اجنبی لوگوں کے ہجوم نے میرا جی ہولا دیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی ادھر چینی، جاپانی، انگریز، امریکی، فرانسیسی اور دوسرے یورپی باشندے تھے۔ ایک بھی پاکستانی یا کم از کم

ہندوستانی باشندہ نظر نہ آتا تھا کہ اسے پکڑ کر زبردستی دوست بنالوں تاکہ اس بھیانک اجنبیت اور تنہائی سے نجات ملے ۔۔۔ شہر کے راستے بھی نہیں معلوم تھے کہ باہر گھوم سکتا۔ پہلا سارا دن اور ساری رات ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے لاؤنج اور ڈانس ہال میں تنہا بیٹھے بیئر اور سگریٹیں پیتے گذر گئی تھی۔ اور دوسرے دن تو کمرے لاؤنج اور ڈانس ہال سے جی اکتا گیا تھا۔ اگرچہ ڈانس ہال بڑی دلچسپ جگہ تھی شام اور رات گئے تک اس میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ انگریز امریکی اور یورپی بحریہ کے سپاہی شرابوں کے نشہ میں دُھت اپنی اپنی "پلیثر گرل" کو جسموں سے لپٹائے ناچتے ناچتے ایسے اوٹ پٹانگ انگریزی گیت گاتے تھے کہ کل آدھی رات تک اس شور کے باعث میں سو ہی نہ سکا تھا۔ باوجود اس کے کہ میرا کمرہ ہوٹل کے چوتھے فلور پر تھا۔

ہانگ کانگ میں میری دوسری رات شروع ہوئی۔ اور حد سے زیادہ بور ہو کر میں نے طے کیا کہ ہرچہ باداباد ...... میں آج اکیلے ہی ہانگ کانگ کی سیر کرونگا۔ اگر راستہ بھی بھٹک جاؤں تو کیا ڈر ہے۔ کسی ٹیکسی کار میں واپس آجاؤنگا آخر کاؤلون ہنٹنولا ہوٹل تو یہاں کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ سارے ٹیکسی ڈرائیور جانتے ہونگے۔ کیونکہ ہوٹل کے سامنے ہی کتنا بڑا ٹیکسی اسٹینڈ ہے۔ اور یوں بھی

تو میری ساری زندگی مہماتی طرز کی رہی ہے، ایک اور مہم سہی ایک اور حادثہ اور ایک اور تجربہ سہی! کم از کم زندگی میں ایسی کوئی بات تو ہوگی جو ہمیشہ یاد رہے گی اس کے علاوہ میری جیب میں پورے نوسو پچاس ہانگ کانگ ڈالر تھے ---
جب جیب میں پیسہ ہو تو پریشانی پردیس میں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہاں اگر جیب میں پیسہ نہ ہو تو اپنے وطن کی اپنی میکلوڈ روڈ پر بھی رسوا کر دیتی ہے۔

ابھی رات کی بتیاں جلنے میں بڑی دیر تھی نہا دھو کر میں نے اپنا رات کا سوٹ پہنا اور سرِ شام نیچے ہوٹل کی لابی میں آیا لابی میں گوروں اور تفریحی عورتوں کا ازدھام تھا۔ میں بھی تفریحاً تھوڑی دیر کے لیے ایک منزل پر بیٹھ گیا کہ ایک بوتل بیئر پی کر باہر نکلوں گا تو رات اور بھی سندر نظر آئے گی۔

ایک چینی ویٹرس قریب آئی اور میں نے اسے آڈر دے دیا۔
ایک بوتل ٹیوبرگ بیئر اور بلیک اینڈ وہائٹ سگریٹوں کا ایک ڈبہ۔
ابھی میں نے بیئر کا پہلا پگ بھی ختم نہ کیا تھا کہ ایک فرنگی حسینہ، ایک دم بھرپور جوانی، ارغوانی رنگ، شانے اور بالائی نصف چھاتیاں عریاں، بال سنہرے، آنکھیں نیلی۔ جسم برجست، پھرتیلا اور سرو قد — میرے میز کے قریب آئی اور انگریزی میں مجھ سے کہا۔

"معاف کیجئے۔ کیا آپ نے مسٹر پرکاش چندر کو یہاں کہیں دیکھا ہے؟"

پرکاش چندر ---!! میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور انگریزی میں

جواب دیا

"ڈیل مادام! میں نہیں جانتا پرکاش چندر کون ہے ۔"

اس نے کچھ عجب نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا

"کیا تم ہندوستانی نہیں ہو؟

میں نے جواب دیا

"نہیں میں تو پاکستانی ہوں۔ اور یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں کہ ہر ہندوستانی

دوسرے ہندوستانی سے واقف ہو جب کہ ہندوستان کی آبادی ۳۰،۴۰ کروڑ

ہے۔

یہ کوئی مسکرانے والی بات تو نہیں تھی۔ لیکن وہ مسکرائی کچھ ایسی پراسرار

مسکراہٹ کہ بیئر کا پیگ منہ لگاتے لگاتے میں نے میز پر رکھ دیا اور غور سے

دیکھا کہ مسکراہٹ میں اس کے سرخ سرخ ہونٹ کچھ اس طرح کھلے ہیں جیسے

کوئی دعوتی رقعہ کھلتا ہے ۔۔ میں اس مسکراہٹ کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ گیا اور سوچا

دعوت ضرور قبول کر لینی چاہیے۔ تاکہ پچھلے تین چار روز سے چمٹی ہوئی تنہائی مجھ

سے الگ ہو جائے۔ دعوت قبول کرنے میں قطعاً دیر نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ نام نہاد اعلیٰ نسل ادنیٰ نسل کے اتنے قریب آگئی ہے۔ اور سرخ و سفید رنگ سیاہ رنگ میں کھلنے ہی والا ہے۔ اسی لئے میں نے ذرا سے شوخ لہجے میں کہا

"مادام — چلو تھوڑی دیر کیلئے یہ فرض کر لو کہ میں ہی پرکاش چندر ہوں، اور یہ چاہتا ہوں کہ کچھ تمہاری خاطر مدارات کروں۔"

وہ پھر مسکرائی جیسے اس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے پرکاش چندر فرض کر لیا ہو۔ اور شکریہ ادا کر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی —

"اچھا خیر! میں تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر پرکاش چندر کا انتظار کر دوں گی۔"

پھر پرکاش چندر! مجھے ذرا سا غصہ آیا۔ لیکن میں نے مسکراتے ہوئے شرارتاً کہا

یہ عجب بات ہے مادام۔ تم اس شخص کا انتظار کر رہی ہو جو بالکل تمہارے سامنے بیٹھا ہے — اچھا چھوڑو ان باتوں کو! تم کیا پیو گی؟ بیئر یا دھسکی، برانڈی۔ شمپئن، پورٹ وائن، شیری — کیا پیو گی؟

میں نے اس کے سامنے اتنی بہت سی شرابوں کے نام اس لئے گنا ڈالے کہ اس پر رعب پڑے کہ اس کا میزبان بہت امیر آدمی ہے۔ جو اس کی یہ ساری

شرابیں پلا سکتا ہے! وہ ہنس مکھ عورت پھر مسکرائی اور اپنی ہاتھ پر اپنی بلوریں ٹھوڑی کو ٹکا کر دھیرے سے بولی

"شکریہ! میں بیئر پیونگی"

میں نے ویٹرس کو بلایا اور پہلا بل ادا کرتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر اپنے پرس سے پورے نو سو پچاس ہانگ کانگ ڈالر نکالے تاکہ وہ مجھ سے میرے کالے رنگ سے نہ سہی تو کم از کم ان نو سو پچاس ڈالروں سے مرعوب ہو جائے اور میری دوست بن جائے تاکہ ہانگ کانگ میں میرے اگلے آٹھ دنوں پر اجنبیت اور تنہائی کے بادل نہ چھا سکیں۔

میں نے دیکھا۔ اتنے بہت سے ڈالروں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجب چمک آئی اور اس نے کہا

"تم تو بڑے مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے زبردستی بے تکلف بنتے ہوئے اپنا پرس اس کی طرف بڑھا دیا

"لو ـــــ یہ تمہارا ہے ڈارلنگ۔ تمہاری نذر۔"

وہ ہلکے سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور شرما گئی۔ پتہ نہیں کہ وہ اسکے گالوں پر شرم کی لالی تھی یا صرف میکس فیکٹر کا رنگ ـــــ بہر حال میرا مذاق یا میرے

ڈالر اسے بہت پسند آ گئے تھے۔ اور میں اپنے دل ہی دل میں اپنے سابق ہموطن لیکن اجنبی رقیب مسٹر پرکاش چندر سے کہہ رہا تھا

"اب آؤ تو سامنے مسٹر پرکاش چندر! ذرا تم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں"

لیکن دل پھر ڈرا کہ کہیں سچ مچ پرکاش چندر نہ آ دھمکے اور سارا مزہ کرکرا نہ ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پرکاش چندر کی جیب میں نو سو پچاس سے بھی زیادہ ڈالر ہوں۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ ہندوستانی جو تاجر ہانگ کانگ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں وہ بہت مالدار ہیں۔ بڑے لاکھپتی اور کروڑپتی ہیں۔ اس ڈر سے میں نے سوچا مجھے ابھی فوراً اپنا تعارف کروا کر اسے بے حد مرعوب کر لینا چاہئے تاکہ پرکاش چندر ابھی جائے تو وہ میری میز سے نہ اٹھ سکے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا۔

"عجب بات ہے مادام۔ ہم دونوں بغیر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ اخلاقاً یہ رسم پہلے ہی ادا ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن میں تمہارے حسن سے کچھ ایسا مسحور ہو گیا تھا کہ سب کچھ بھول گیا۔

اپنے حسن کی تعریف سن کر اس کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں اور گال لال ہو گئے۔ میں نے کہا ــــ

"اچھا، چلو پہلے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔"

تعارف کے دوراں میں میں نے اپنے بارے میں ساری باتیں غلط اور مبالغہ آمیز بتائیں۔ یعنی میں نے اس سے کہا کہ میں پاکستان کا ایک کروڑپتی تاجر ہوں اور میری دوکان کی شاخیں دنیا کے سارے بڑے شہروں میں قائم ہیں اب ہانگ کانگ میں بھی ایک شاخ قائم کرنے آیا ہوں۔ میرا نام حمید خاں ہے ـــ لیکن سب سے زیادہ زور میں نے جس بات پر دیا تھا وہ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اور کسی عورت کی محبت میں نہیں مبتلا ہوا میرے جھوٹ اور مبالغے کے علاوہ میری آخری بات کا شاید اس پر سچا اثر پڑا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی ـــ

"میرا نام مس سیلویا پیٹرس ہے۔ اور میں ہانگ کانگ کے مشہور نائٹ کلب "تھری زیرو نائٹ کلب" کی ڈانسر ہوں۔"

یہ سن کر مجھے یک گونہ اطمینان ہوا۔ لیکن پھر بھی پرکاش چندر کانٹے کی طرح دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس لئے میں نے پرکاش چندر کے بارے میں بھی تھوڑی سی معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا تاکہ کانٹا ہٹانے میں زیادہ آسانی ہو۔ مس سیلویا پرکاش چندر کے بارے میں بتانے لگی :۔

"پرکاش چندر ادھیڑ عمر کا شادی شدہ آدمی ہے۔"
میں بڑا خوش ہوا کیونکہ میں تو ابھی نوجوان ہوں، اور شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی ہر رات عجب قسم کا غیر شادی شدہ ہو جاتا ہوں۔
"پرکاش چندر کا رنگ گندمی ہے۔ اور اس کی توند بہت بڑی ہے۔"
میرا رنگ بھی گندمی ہے۔ لیکن جوانی کے باعث وہ شاید پرکاش، چندر کے رنگ سے زیادہ ہی صاف ہو۔ اور میری توند بھی تو نہیں ہے۔ میں ایک سلیم اور اسمارٹ نوجوان ہوں۔ جس نے ٹینس کھیل کھیل کر ایسا متناسب جسم تیار کیا ہے
میں نے خوش ہو کر مس سیلیو یا کو بیئر کا چوتھا پگ پیش کیا۔ تین پگ پی جانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں نشے کے ہلکے ہلکے سے سرخ ڈورے آگئے تھے۔ اس کی آنکھیں جو پینے سے پہلے بھی نشیلی تھیں اور ـــــ وہ نشیلی ہو گئی تھیں خوبصورت ہو گئی تھیں۔ دلآویز ہو گئی تھیں بلکہ ہیجان انگیز ہو گئی تھیں۔ اور وہ کچھ کچھ بہکنے لگی تھی اور زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اور اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس، آکر بیٹھ گئی تھی اور مجھ سے اتنے قریب آگئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ بھی باقی نہ رہا تھا کہ پرکاش چندر یا کوئی اور رقیب روسیاہ یا رقیب سُرخرو جو میرے سامنے ایک جاپانی لڑکی کو گلے سے لٹکائے ناچ رہا تھا، وہاں سما سکتا۔

پھر بھی ایک اندیشہ تھا کہ میری اور اس کی دوستی کی مدت صرف چند لمحوں کی ہے
ہو سکتا ہے کہ پرکاش چندر کی اور اس کی بڑی لمبی اور بڑی پرانی دوستی ہو۔ اور
وہ لمبی اور پرانی دوستی اس کو مجھ سے نوچ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ اگرچہ میری
جیب میں بہت سے ڈالر تھے اور بہت سے ڈالر تو بڑی لمبی لمبی اور پرانی پرانی
دوستیوں اور محبتوں کو خرید سکتے ہیں۔ انسان تو کیا بڑے بڑے ملک اور
بڑی بڑی قومیں خرید لیتے ہیں۔۔۔ ایک اور اندیشہ چپکے سے میرے کان میں
یہ بھی کہہ رہا تھا کہ دیکھو دیکھو لابی میں بیٹھے ہوئے سارے سفید رنگ مرد اور عورتیں
تمھیں اور مس سیلیویا کو ناک بھنویں چڑھا کر دیکھ رہے ہیں ـــــ یہاں سے کہیں
چلے جاؤ۔ باہر صرف سٹریٹ لیمپوں اور ستاروں کی آنکھیں تمہیں دیکھیں گی جن میں
نفرت کے بجائے خوشی ہوگی کیونکہ ستارے سٹریٹ لیمپ ہر صبح اور شام
اسی طرح اجالے اور اندھیرے کو اس طرح گڈمڈ دیکھتے ہیں جس طرح تم اور
مس سیلیویا پیٹرس!

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ باہر چلا جائے۔ سیر کی جائے۔ مس سیلیویا پیٹرس
کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر آوارہ گھوما جائے۔ ورنہ کہیں پرکاش چندر یا پھر
کوئی امریکی راک فلو آدھمکا تو رات بڑی سنسان اور لمبی ہو جائے گی۔ باہر

چلنے پر سیلویا کو آمادہ کرنے کے لئے میں نے ایک تمہید باندھی۔ میں نے بڑے
ڈرامائی انداز میں اپنی تنہائی اور بیچارگی سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کی
پہلے تو میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس کی جیسے میں بڑا اداس ہوں اور بولا
"ڈیر مس پیٹرس کتنی عجب بات ہے کہ تمہارا شہر اتنا پر شور، اتنا آباد اور
اتنا خوبصورت ہونے کے باوجود اتنا ویران ہے کہ مجھ جیسا اجنبی اس میں داخل
ہو کر بے حد اداس ہو جاتا ہے۔ میں تو ایک دن اور ایک ہی رات میں تمہارے شہر
سے اتنا اکتا گیا ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ آج ہی اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤں
بتاؤ مجھے رائے دو۔ کیا میں کل صبح کے ہوائی جہاز سے واپس چلا جاؤں؟"
مس سیلویا پیٹرس ایک نائٹ کلب ڈانسر تھی۔ ایک تفریحی عورت تھی۔ میرے
سیاہی مائل رنگ اور میری آریائی نسل سے دل ہی دل میں نفرت کرنے والی ایک
سفید نسل تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک عورت تھی جس کا دل اس کے جسم کی طرح نرم
اور گداز تھا۔ اور اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں نشے کی لالی بھی آ گئی تھی اور اسکے
بھی علاوہ میرے جیب میں پورے نو سو پچاس ہانگ کانگ ڈالر تھے — وہ
بھلا ایک مسافر کو اپنے نو سو پچاس ڈالر بچا کر کس طرح ہانگ کانگ سے باہر
چلے جانے دیتی!! اس نے شاید اداکاری کرتے ہوئے یا پھر سچ مچ متاثر ہو کر میرے

ہاتھ پر اپنا سرخ سفید ہاتھ رکھ دیا اور عجب آزردہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ۔۔۔

"دیکھو ۔۔۔ میں ایک پلیسیر گرل ہوں میرا پیشہ اب یہی ہے کہ اجنبیوں کے دل بہلاؤں میں پہلے پہلے امریکی فوج کے ایک دستے کے ساتھ ٹوکیو اور پھر وہاں سے کوریا بھیجی گئی تھی تاکہ میری موجودگی میں امریکی سپاہیوں کو ان کا وطن، انکی بیویاں یا ان کی محبوبائیں یاد نہ آئیں۔ میں اور میری طرح سینکڑوں لڑکیوں نے اپنی نوجوانی کا آغاز فوجی سپاہیوں کے آغوش میں کیا۔ جب دنیا میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ لیکن اب مجھے ایک سپاہی کی آغوش سے نفرت ہو گئی ہے کوریا سے میں ایک سپاہی کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے بیاہ کرنے اور اس کے بچوں کی ماں بننے کے خوش آگیں تصور کے ساتھ میں سیئول سے ہانگ کانگ آگئی لیکن ہماری شادی سے چار روز پہلے میرے ہونے والے شوہر کو ٹوکیو سے حکم ملا کہ وہ ایک امریکی مرد ہے اس لئے غیر امریکی عورت سے شادی نہیں کر سکتا، میرا محبوب میری خاطر امریکی قومیت کو بھی ٹھوکر لگانے والا تھا۔ لیکن ایک رات ایک ہوائی جہاز اسے ہانگ کانگ سے ٹوکیو اور اس کے بعد نہ جانے کہاں اڑا لے گیا ۔۔۔؟ اب تک میں اڑتے ہوئے ہوائی جہازوں کو بڑی حسرت سے تاکا کرتی

ہوں۔ لیکن ہوائی جہاز بہت بلندیوں پر اڑتے ہیں اور امریکہ بہت دور ہے
—— ایک عورت اور ایک مرد کے دھڑکتے ہوئے دلوں کے درمیان پھیلا ہوا
ہے ——"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے سے آنسو آ گئے اس نے اپنے بیگ
سے رومال نکالا اور آنسو پونچھتے ہوئے زبردستی ہنس پڑی اور بولی۔
"ہاؤ فولش ایم آئی —— میں کتنی جذباتی ہو گئی تھی۔ معاف کرنا میں تمہیں دراصل
یہ بتا رہی تھی کہ مجھے سپاہی کی آغوش سے نفرت ہے کیونکہ سپاہی کی آغوش ایک
عارضی آغوش ہے اور اس کی آغوش اتنی لچکدار ہوتی ہے کہ اس میں ہر جسامت
کی عورت سما سکتی ہے۔ ایک دبلی پتلی عورت کے لئے اس کی آغوش سکڑ جاتی ہے اور ایک موٹی
بھاری بھرکم عورت کے جسم کے لئے اس کی آغوش یا تو بہت زیادہ
ڈھیلی ہے یا بہت زیادہ تنگ —— اس کی آغوش میں ایک اور صرف ایک عورت ہمیشہ کیلئے
کبھی فٹ نہیں آ سکتی —— اور پھر اس کی آغوش کی گرمی کی مدت ہی کیا ہے؟ صرف ملیٹری
پولیس کے بوٹوں کی آواز میدانِ جنگ کا بگل —— پھر اس کے بعد سپاہی چلا جاتا ہے۔ پھر
اس کے بعد عورت مہیب تنہائی کے آغوش میں گر پڑتی ہے۔ پھر اس کے بعد سپاہی کبھی
واپس نہیں آتا۔ پھر اس کے بعد عورت آبادیوں پر سے گذرنے والے ہر ہوائی جہاز کو

دیکھ کر ڈر پڑتی ہے ۔

اسی لئے بالکل اسی لئے میں اب سیاہی کی آغوش سے اکتا گئی ہوں اور مجھے ایک ایسی آغوش کی تلاش ہے جس میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک سمائی رہوں ۔

شاید مس پیٹرس کو بہت نشہ ہو گیا تھا ۔ اور وہ یہ بھول کر کہ میری جیب میں نو سو پچاس ڈالر ہیں اور وہ ایک گاہک پھانسنے والی تفریحی عورت ہے سچی سچی باتیں کرنے لگی تھی اور اچانک عورت بن گئی تھی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ کاش چند روز کی آغوش اسے دن بدن "عورت" میں تو نہیں تبدیل کر رہی ہے ۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ کاش وہ صبح تک اسی طرح عورت ہی رہے ۔ اس کے جسم میں جو سچ مچ کی عورت جاگ پڑی ہے ۔ وہ صبح تک جاگتی ہی رہے ۔ کیونکہ میں اس رات کا ساتھی یا بستر کا ساتھی نہیں بنانا چاہتا تھا ۔ بلکہ میں چاہتا تھا کہ چند گھنٹوں کے لئے سہی ایک سیاہ اور ایک سفید جسم اسی طرح بغل گیر رہیں ۔ اور اس کے علاوہ میں جنسی بھوک سے نہیں بلکہ غریب الوطنی اور اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے اکتا گیا تھا اس لئے میں نے کہا ۔

" اچھا مس پیٹرس ! آؤ چلو اب کہیں باہر چلیں ۔ کسی ہوٹل میں ڈنر کھائیں اور

کوئی فلم دیکھیں، اور اس کے بعد تمہارے نائٹ کلب بھی چلیں گے۔

اچانک مس پیٹریس کے جسم سے "عورت غائب ہو گئی اور نائٹ کلب گرل لوٹ آئی۔ اس نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

"میں اس طرح تمہارے ساتھ باہر نہیں جا سکتی۔ بے تکلفی معاف۔ اتنی ساری باتوں کے باوجود میں ایک نائٹ کلب کی ملازم ہوں اور میرا کام نائٹ کلب کے لئے وزیر ٹیرس فراہم کرنا ہے۔ اگر میں کسی کے ساتھ باہر جاؤں تو ہمارا نائٹ کلب ساتھ لے جانے والے سے دس ڈالر وصول کرتا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ رقص کر دوں تو مزید دس ڈالر اور اگر ـــــ اگر......"

"اگر" کے آگے وہ مسکرائی۔ کچھ نہ کہہ سکی اور کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی جب کہ "اگر" کے آگے کی بات کہنے کی ہوتی ہی نہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم ڈالروں کی فکر مت کرو۔ ڈالر تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں"۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے ٹیکسی میں پرل دریا کے کنارے پہنچے۔ ہانگ کانگ شہر ایک جزیرہ ہے۔ جہاں فری بوٹ سے جانا پڑتا ہے۔ ایک دو منزلہ فری بوٹ تیار کھڑی تھی۔ اس فری کے ذریعے دس منٹ کے اندر ہم جزیرہ

ہانگ کانگ کے بلیک پیر فیری ہالٹ پہنچ گئے۔ بلیک پیر سے تھری زیرو نائٹ کلب ٹیکسی کے ذریعے ۱۵ منٹ کا راستہ تھا۔

تھری زیرو نائٹ کلب کے کاؤنٹر پر جب میں نے ایک بوڑھی موٹی فرنگی عورت کو مس سیلویا پیٹرس کی رفاقت کے دام ادا کرنے کے لئے پرس کھولا تو مس پیٹرس ایک منٹ کی اجازت لے کر ٹائلٹ روم میں چلی گئی اس کے چلے جانے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی بوڑھی موٹی فرنگی دلالہ نے منہ بنا کر تلخ لہجے میں کہا۔

"ہم اپنی لڑکیوں کو ایشائی باشندوں کے ساتھ نہیں بھیجتے تم چاہو تو دوسری لڑکی کے ساتھ لے جا سکتے ہو! ہمارے پاس ایشائی لڑکیاں بھی ہیں برمی، سیامی، جاپانی، چینی ــــ تم کس کو پسند کرو گے؟

میں نے اس خبیث بڑھیا کو بڑی نفرت سے گھور کر دیکھا اور بولا۔

"میں یہاں عورت کا جسم خریدنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے صرف ایک ساتھی کی تلاش ہے جو اس اجنبی شہر میں میری تنہائی کو دور کر سکے اور مجھے اس شہر کی سیر کرا سکے۔ میں وہ ہانگ کانگ دیکھنے نہیں آیا ہوں جس کو دیکھنے کیلئے سیلویا پیٹرس کے جسم سے گذرنا پڑتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کو

ایشیا کی قوت کا مزہ چکھاتا۔ اور پھر یہ بتاؤ جب تم اپنی نام نہاد اعلیٰ نسل اور
نام نہاد سفید رنگ کی عظمت اور عظمت اور عزت بیچ ہی رہی ہو تو پھر یہ کیوں
دیکھتی ہو کہ خریدار کا رنگ کیا ہے اور نسل سے تعلق رکھتا ہے
تم تو صرف ڈالر گنا کرو!۔

بوڑھی صرافہ غصہ سے بڑے زور سے چیخ پڑی — شٹ اپ!!۔
کہ ہال میں بیٹھے ہوئے بہت سے امریکی انگریز اور دوسرے سفید فام
عیاش اپنی اپنی میزوں سے اٹھ کر کاؤنٹر کے قریب آگئے۔ انکو دیکھ کر
بوڑھی صرافہ جیسے اور زیادہ شیرنی ہو گئی اور زیادہ تیز آواز میں چیخنے لگی
یہ شور سن کر مس پیٹرس بھی دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے مجھ سے ماجرا پوچھا تو میں
نے اس کو ساری بات دو تین جملوں میں بتا دی۔ ہو سکتا تھا کہ اس نائٹ
کلب میں یا اس امریکہ یا اس برطانیہ میں ایک چھوٹی سی نسل و رنگی لڑائی چھڑ
جاتی۔ لیکن مس پیٹرس جسے سیاہی کی آغوش سے نفرت ہے جسے جنگ سے
نفرت ہے۔ اور جو خوبصورت ہونے کے علاوہ سمجھدار بھی ہے۔ اس
نے بوڑھی صرافہ کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی
ممی یہ میرا مہمان ہے۔ میں اسے یہاں ساتھ لائی ہوئی ہوں۔ تمہیں میرے

معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے

اور پھر اس نے مسکرا کر ارد گرد جمع ہوتے والے سفید فام رقیبوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی میز پر چلے جائیں۔ سفید فام رقیب مس ہیرٹس کو غصہ اور شکایت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی میز پر چلے گئے پھر مس ہیرٹس نے بے تکلفی سے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر میرا پرس نکالا۔ اور اس میں سے ۸۰ ڈالر گن کر نکالے۔ اور کاؤنٹر پر ممی کے سامنے پھینکتے ہوئے مجھ سے بولی۔

ڈیر لٹل کویر تھینک — آؤ چلتے ہیں۔

اس وقت اس کا سفید ہاتھ میری کمر کے گرد تھا۔ ممی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور وہ جیسے سفید نسل پر سیاہ نسل کے بڑھتے ہوئے سائے سے خوفزدہ اور خشمگیں تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ مرافہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی رنگی ونسلی بے بسی کا انتقام لے لوں۔ کیونکہ میں نے صرف ۸۰ ڈالر کے عوض ایک تمکنت آفریں رنگ اور ایک پوری مغرور سفید نسل خرید لی تھی۔ یہ ایک بہت گھٹیا اور بڑا رجعت پسندانہ فعل سہی لیکن کبھی کبھی گھٹیا پن کا احساس بھی بڑائی کی طرف پوری قوت سے رجوع کراتا ہے۔

میں مس بٹرس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر باہر نکلا لیکن دروازے پر ہی میری نظر ایک نوجوان جاپانی لڑکی پر پڑی جو ایک لمبے تڑنگے امریکی سپاہی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ جاپانی لڑکی ایک ننھی منی سی خوبصورت گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا چھوٹا سا بھولا بھالا پیلا چہرہ، سر پر پگوڈے کی چھت کی طرح سنوارے ہوئے بال۔ سرخ بیل بوٹوں والا زرد فراک، اس میں کسا کسا ڈھگنا جسم اور چھوٹی چھوٹی چندھی آنکھیں —— باتیں کرتے کرتے اس امریکی سپاہی نے اس ننھی سی جاپانی لڑکی کی کمر میں اپنی لمبی لمبی باہیں ڈال دیں - اور اسے اپنی باہوں میں بری طرح جکڑ لیا۔ جیسے جاپان کی دوبارہ اسلحہ بندی ہو رہی ہو —— میں نے بیٹرس کی طرف اور پھر پلٹ کر کاؤنٹر پر ممی کی طرف دیکھا۔ جو اپنے پوپلے منہ میں سے میلے پیلے دانت نکالے مسکرا رہی تھی - ایک ایشیائی عورت کو اپنی باہو میں جکڑ لیتا ہے - تو اس کے میلے پیلے دانت پوپلے منہ سے باہر نکل پڑتے ہیں —— جاپانی لڑکی اس امریکی مرد کی باہوں سے چھٹکارہ پانا چاہتی تھی۔ اور اپنا منہ اس کے بڑھتے ہوئے منہ سے بچانے کے لئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہی تھی -

"مجھے چھوڑ دو —— مجھے تنگ نہ کرو۔ پہلے ممی سے دام طے کرو -"

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ سارا جاپان چیخ چیخ کر
اس امریکی سپاہی سے کہہ رہا ہے۔

گو بیک یانکی!

گو بیٹ جاپان یانکی!!

گو ہوم یانکی!!!

اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ یانکی نے جاپانی لڑکے کے ہونٹوں سے زبردستی ایک بوسہ چرا لیا۔ جیسے صلحنامہ جاپان پر امریکہ نے دستخط ثبت کر دئے ہوں۔ مجھے پتہ نہیں غصہ آیا یا میں بیئر کے نشے میں بہک گیا تھا۔ میں کاؤنٹر کی طرف جانے لگا۔ مس پیٹرسن نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا

واپس کہاں جا رہے ہو۔؟

میں نے کہا۔

ڈارلنگ سیلویا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ مجھے یہ لڑکی بھی پسند آ گئی ہے۔

مس سیلویا پیٹرسن نے عجب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یا تو تم بھی پی گئے ہو یا سچ مچ عجب آدمی ہو۔ کیا میں، ایک کافی

نہیں ہوں ؟

میں نے سیلویا کو اپنے اور قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

ڈارلنگ سیلویا ــــ میں، میں صرف ایک کمپنی چاہتا ہوں - صرف رفاقت ــــ

مس سیلویا نے کوئی اعتراض نہیں کیا ــــ اور یوں بھی اسے اس کے دام مل چکے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر جاکر اس جاپانی لڑکی کے لئے ۴۰ ڈالر نکالنے چاہے تو مس سیلویا نے مجھے روک دیا اور کہا:

صرف پچاس ڈالر کافی ہیں! وہ جاپانی لڑکی ہے نا ــــ ایشیائی لڑکیوں کے دام کم ہوتے ہیں۔ میں چونکہ انگریز عورت ہوں۔ اس لئے ــــ

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ دنیا کیسا بھیانک بازار ہے۔ میدانِ جنگ ہو یا قحبہ خانہ۔ ایشیائی جسم دونوں جگہ کوڑیوں کے مول بکتے ہیں ــــ غصہ اور ندامت سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے پچاس ڈالر ادا کر دئے۔ اور ایک ہاتھ مس سیلویا کی کمر میں اور ایک ہاتھ جاپانی لڑکی کی کمر میں ڈال کر بڑے فاتحانہ انداز میں اس امریکی سپاہی کے قریب سے گذرا۔ امریکی سپاہی نشے میں دھت نائٹ کلب کی ایک ستون سے

ٹیک لگائے کہہ رہا تھا۔

"جونی —— اینجائے اینجائے۔ زندگی بغیر عیش کے کچھ بھی نہیں دش

بوائے ہیپی نائٹ! لیکن بتاؤ تم کہاں جارہے ہو۔ تم ٹوکیو جا رہے ہو۔

میں جانتا ہوں تم ٹوکیو جا رہے ہو!

میں نے طنزیہ مسکراہٹ میں جواب دیا۔

"نہیں —— میں ٹوکیو نہیں —— میں تو وال اسٹریٹ جا رہا ہوں یا نکی!"

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"سلی —— وال اسٹریٹ بہت دور ہے۔ بہت دور ہے۔"

میرا جی چاہا کہہ دوں۔

بیوقوف —— وال اسٹریٹ کہاں دور ہے۔ وہ تو اب بھی میرے

بغل میں ہے۔

آدھی رات تک ادھر ادھر گھومنے کے بعد میں مس سیلیویا اور جاپانی

لڑکی کے ساتھ اپنے ہوٹل لوٹا۔ اور اپنے ڈرائنگ روم کے لمبے صوفے پر

جاپانی لڑکی کو لٹاتے ہوئے میں نے کہا ——

میری چھوٹی سی گڑیا —— تم صبح تک یہیں سوتی رہو۔ آرام سے

سوتی رہو ــــــ!

جاپانی لڑکی حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ لیکن میں نے اپنے بستر کا کمبل اس پر اڑھا دیا۔ وہ ٹکر ٹکر مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اور میں شب بخیر کہنے کے بجائے اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اپنی بیڈ روم میں لوٹا اس وقت مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں نے اس جاپانی لڑکی کو امریکی نائٹ کلب سے آزاد نہیں کرایا ہے بلکہ جاپان کو امریکہ کے گناہ آلود اندھیرے سے بچا لیا ہے۔ اس کو اسلحہ بندی سے بچا لیا ہے۔ اس کے جسم کو مزید دستخطوں کے داغوں سے محفوظ کر لیا ہے ــــــ صرف ایک ہی رات کے لئے سہی ــــــ ایک رات بھی تو کبھی کبھی ایک عورت کی پوری زندگی کو سنوار دیتی ہے۔

بیڈ روم میں مس سیلویا اور میں پھر بیئر پینے لگے۔ مس سیلویا نے ایک بار گھڑی دیکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اُف فوہ ــــ ساڑھے چار بج رہے ہیں تم سوتے نہیں کیا؟"

میں نے مس سیلویا کے سرخ و سفید جسم کو اپنے سیاہ جسم کی آغوش میں بھینچ کر کہا۔

ڈارلنگ سیلویا ــــ اب سونا کیا ہے ـــ اب صبح ہو رہی ہے
اب ہم یونہی ایک دوسرے سے بغلگیر بیٹھے صبح کے اجالے کا استقبال
کریں گے۔

سیلویا نے مسکراتے اور شرماتے ہوئے پوچھا۔
لیکن تم جس کام کے لئے مجھے یہاں لائے تھے ــــ وہ ـــ
وہ ، اس کا کیا بنے گا ـــ؟

میں نے اس کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
سیلویا پیاری ـــ وہ کام تو کبھی کا ہو چکا اور اب رات گذر چکی
ہے اور اب صبح ہو رہی ہے۔
سیلویا نے ایک جمائی لیتے ہوئے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور بولی
"تم سچ مچ بڑے عجیب آدمی ہو۔ مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے۔ میں تو
اب سوتی ہوں"

شاید سیلویا نے آنکھیں بند کر لیں مگر میں نے کہا۔
"سیلویا ـــ اب تم سو جاؤ تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن میری یہ
بات یاد رکھو اسی زمین پر ایک اور صبح بھی ضرور طلوع ہو گی۔ جب

سارے انسانوں کا ایک رنگ ہو گا ــــ سفید اور کالا نہیں ــــ صرف انسانیت کا رنگ ــــ کسی نائٹ کلب کے اندھیرے میں نہ تو تمہارا رنگ بکے گا اور نہ تو میری نسل بے آبرو ہو گی ۔ سنتی ہو پیاری سیلویا ــــ میں آج ــــ میں آج . . . . . . "

سیلویا جیسے نیند میں بڑبڑاتے ہوئے بولی :۔

" ڈارلنگ ! تمہیں سخت نشہ ہو رہا ہے تم بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو ۔ اب سو جاؤ ــــ آؤ سو جاؤ ! "

اس کے بعد سیلویا سو گئی

اس کے بعد رات مر گئی ۔

اس کے بعد صبح ہو گئی ۔

اور اس کے بعد انسان جاگ پڑے ؛